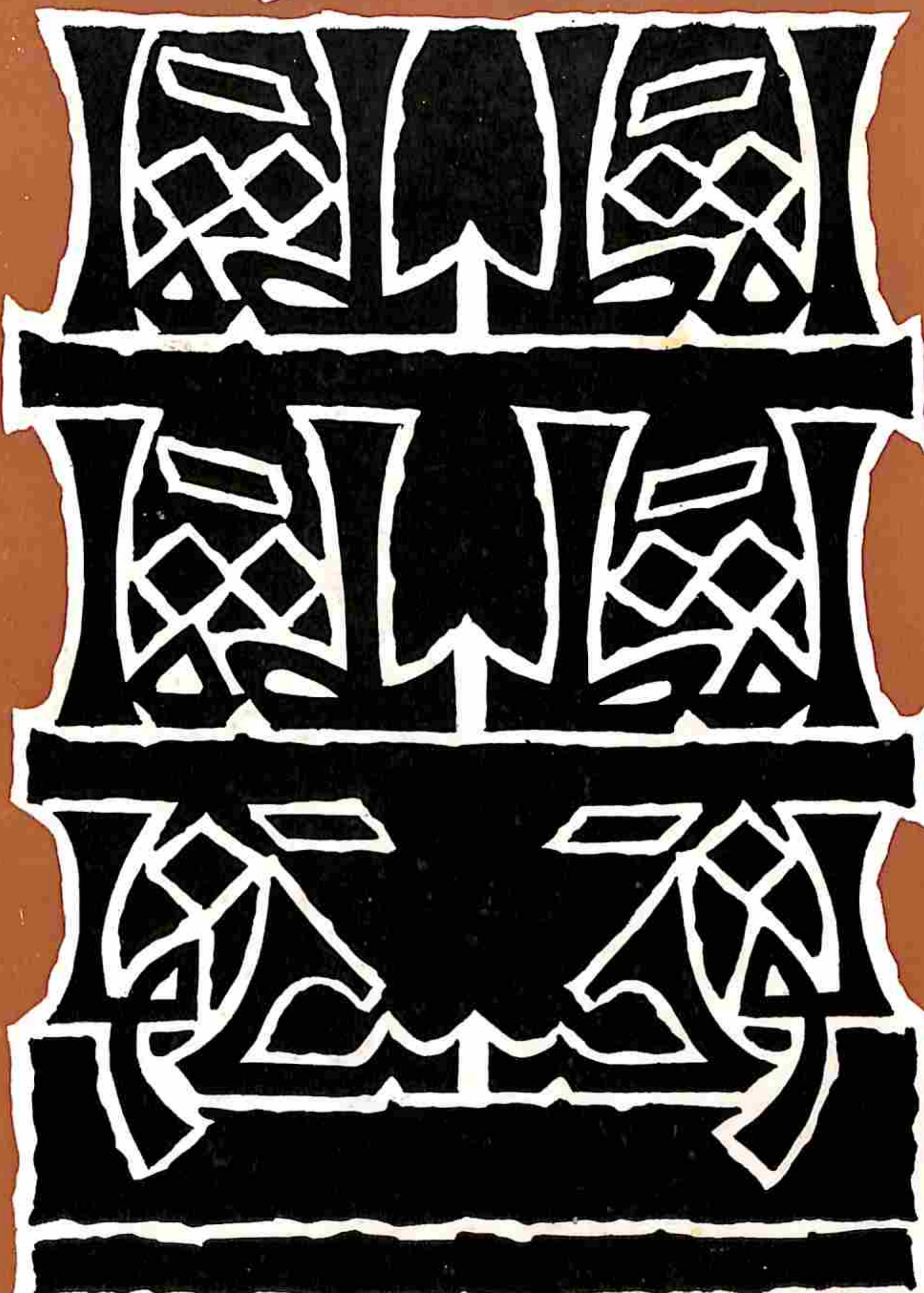
لفظ لفظ لوحہ



لفظ لفظ نوحہ

فاروق نازکی

نام ــــ محمد فاروق نازکی
مولد ــــ سرینگر کشمیر
شعری مجموعے "آخری خواب سے پہلے" ۱۹۹۰ء
"نار ہیوتن کزل ونس" (کشمیری) ۱۹۹۴ء
پتہ ــــ ٹیلی ویژن سنٹر، سرینگر کشمیر

* ترتیب و تہذیب ــــــــ سید مجتبیٰ علی
* سرورق ــــــــ غلام رسول سنتوش
* خوشنویس ــــــــ گلزار احمد
* طبع اوّل ــــــــ ۱۹۸۴ء
* تعداد ــــــــ سات سو
* قیمت ــــــــ ۱۲۵؍ روپے

تابش پبلی کیشنز

سرینگر کشمیر

پیر و مُرشد، والدِ محترم
میر غلام رسول نازکی
کی خدمت میں:

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرہ آفتابِ تابانیم

ایک انتساب اور

سوم ناتھ سادھو، تیرے نام:

جانتا ہے تمہاری ماں کملی
کشمیر چھوڑ کر گئی ہے،
اور اپنے ساتھ
چاندی کی وہ تھالی بھی لے گئی ہے،
جس میں وہ
ہم دونوں کے لئے کھانا پروستی تھی۔
کیا تو جانتا ہے کہ
وہ میرے ڈر سے کشمیر سے بھاگ گئی ہے۔

——— تمہارا

فاروق

لکھوں تو کیسے لکھوں لفظ لفظ کا نوحہ
وہ حرف حرف میں خنجر چبھو گیا ہو گا

ترتیب

غزلیات

نظمیں

کانچ کے الفاظ سے
سنگِ معنی تک

لفظ کی خارجی ہیئت سے معنی کی تشکیل تک، تخلیق کا سفر "گنجینۂ معانی" کی تہہ دار کائنات کو تلاش کرتا ہے۔ اس سفر میں صدیوں کی تہذیبی اور ثقافتی بستیاں بھی ہیں۔ اور احساس و ادراک کے وہ افلاک بھی، جو شاعری کو پیغمبروں کی ہم صفیری کے درجے تک پہنچاتے ہیں۔ ماضی کے زمانوں میں شاعر قریہ قریہ گھوم کر اپنے فن کو دوسروں تک منتقل کرتا تھا۔ مشاہدے اور تجربات کی زنبیلیں بھی بھر لیتا تھا۔ لیکن یہ آج کی دنیا تو ایک GLOBAL VILLAGE ہے۔ شاعر بیرونی دنیا کی بجائے اپنی داخلی کائنات میں انفس و آفاق کو تلاش کر لیتا ہے۔

جدید عہد کے وجودی مفکر ہیڈیگر نے لکھا ہے کہ عہدِ حاضر کی تمام تر فکر اور دانشوری کی بازیافت اب فلسفیانہ رسالوں سے نہیں بلکہ اُس شاعر کے کلام سے ہوتی ہے، جو ایک ہی لمحے میں زمان و مکاں کی لامتناہیوں کو پھلانگ جاتا ہے۔

فاروق نازکی کے تازہ مرتب ہوتے ہوتے مجموعے کا مطالعہ مجھے حیرت و استعجاب اور زمان و مکاں کے ایسے ہی لامتناہی سلسلوں سے وابستہ کر رہا ہے۔

فاروق نازکی کا تعلق وادیٔ کشمیر سے ہے۔ انہیں اپنے ورثے میں ایک ایسی عظیم الشان تہذیبی اور ادبی روایت میسر آتی ہے، جو بیرونِ کشمیر کے فنکاروں کو میسر نہیں ہے۔ اس منفرد روایت کے ساتھ ساتھ نازکی نے جدید فلسفے اور جدید شاعری کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے، اور یورپ کے ان ممالک میں ذرائعِ ابلاغ کی

تربیت حاصل کی ہے ۔جواب سے پہلے جدید فلسفوں کی آماجگاہ رہے ہیں ۔

فاروق نازکی کو وادئ کشمیر کا LANDSCAPE میسر آیا ہے اور یہ زمینی منظر نامہ اتنا منفرد، اتنا تر و تازہ اور ایسا سحر خیز ہے کہ کوئی نیا سے نیا لفظ یا کوئی دور از کار استعارہ بھی اس منظر نامے کے تمام تر حُسن کو اپنے مفہوم میں سمیٹ نہیں سکتا۔ زندگی خیز تجربات اور وادی کے منظر نامے نے فاروق نازکی کے فن کو ایسی حرارت بخش دی ہے کہ اُن کی شاعری کی لفظیات میں آئینہ نما بر فاب بھی موجود ہیں، اور سنگلاخ معانی بھی۔ گویا فاروق نازکی کا ہر مصرع غالب کے اس مصرع کا عکس بن گیا ہے

"دست تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

فاروق نازکی نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، دونوں اصناف میں فاروق کا اظہار ایک دوسرے سے مختلف ایک دوسرے سے نبرد آزما اور مفاہیم کی تازہ کار کائنات سے ہم کنار ہے۔ غزل میں یکسر نیا لہجہ ۔۔! جدید غزل کے اسلوب کو اور زیادہ نکھارتا ہوا ۔۔۔۔ اپنے ہم عصروں سے گوئے سبقت لیتا ہوا۔۔ اور نظموں میں فن، اسلوب اور تشکیلی ہیئتوں کا ایسا تجربہ کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو بھی پس ساختیاتی طرز کے تجزیوں کے لئے ایک نیا معیار میسر آسکے۔

فاروق نازکی کی غزل میں متضاد عوامل کے درمیان مفاہیم کی تشکیل اور متن میں پوشیدہ ساختیاتی رشتوں کی نشاندہی کے لئے کچھ اشعار پر نظر ڈالئے :-

گہری نیلی شام کا منظر لکھنا ہے
تیری ہی زلفوں کا دفتر لکھنا ہے

کئی دنوں سے بات نہیں کی اپنوں سے
آج ضروری خط اپنے گھر لکھنا ہے

شدت پر ہے ہرے بھرے پتوں کی پیاس
صحرا صحرا خون سمندر لکھنا ہے

کانچ کے الفاظ کاغذ پر نہ رکھ
سنگِ معنی بن کے ٹکراؤں گا میں

میں ہوں مضطر بدن کی نگری میں
میرے حصے میں لامکاں رکھنا

دیارِ خواب و چشمِ دل فگاراں
جزیرہ نیند کا کیوں درمیاں ہے

حصارِ خوف و ہراس میں ہے، بتانِ وہم و گمان کی بستی
مجھے خبر ہی نہیں کہ اب میں جنوب میں یا شمال میں ہوں

فاروق نازکی کی غزل میں ایسے بیشمار شعر ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد پہلا احساس تو یہ ہوتا ہے کہ نازکی نے جدید غزل کو اُس منزل سے اپنا ہمنوا بنایا ہے جہاں ناصر کاظمی نے اِسے چھوڑا تھا۔ دوسری بات جو نازکی کی غزل میں نمایاں ہے وہ ہے ہیئت کی نئی ساخت ——— دو متضاد اور ناگفتہ مناظر، عوامل اور مفاہیم کے درمیان ایک نئے معنوی رشتے کی تشکیل ——— اِس مقصد کے لئے فاروق نے کلاسیکی غزل یا جدید غزل کی رسمیات کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ ہر شعر کو مختلف رنگوں کی تیزی سے رقص کرتی ہوئی مشعل بنایا ہے۔ جس میں ابتدائی سطح پر رنگ الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہر ایک لفظ اپنے منفرد رنگ کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ پھر مفہوم کا چکر ویو اِن رنگوں کو ایک مشترک ساخت، ایک انفرادی تشکیل اور ہیئت میں بدل دیتا ہے۔ تب اس چکر ویو سے مفاہیم کا سرچشمہ طلوع ہوتا ہے اور فاروق نازکی انتہائی انوکھے منفرد اور ہمہ جہت شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ غزل کی روایت اگرچہ پژمردہ اور پامال ہو چکی ہے، لیکن فاروق نازکی نے اِسے اپنے اسلوب اور طرزِ فکر سے ایک نئی زندگی عطا کر دی ہے۔

فاروق کی اِن غزلوں کا ایک اور پہلو اِن کی لفظیات سے ظہور پذیر ہونے والا وہ MONTAGE اور وہ COLLAGE ہے، جو شعر کی خارجی ہیئت کو اور الفاظ کو رنگ و آہنگ میں تبدیلی کر دیتا ہے، جو اشعار درج کئے جا چکے ہیں۔ اگر صرف اُن کی لفظیات کو ہی پیشِ نظر رکھا جائے تو گہری نیلی شام، زلفوں کا دفتر، ہرے بھرے پتوں کی پیاس، صحرا صحرا، خون سمندر، بدن کی نگری، دیارِ خواب، جزیرہ نیند کا، یہ تمام عوامل جو MONTAGE بناتے ہیں۔ اُن میں تشکیل اور ردِ تشکیل کا فلسفہ اور JACQUES DERRIDA کے تخلیقی اور تنقیدی افکار کی کسوٹی موجود ہے۔

فاروق نے اپنی غزل میں عکس اور معکوس، مثبت اور منفی تصورات کے درمیان ایک نئے رشتے کو دریافت کیا ہے۔ اِس نئے رشتے کی جستجو میں فاروق نازکی نے منظر نامے کی تخلیق سے مفاہیم کی ایک نئی ایسی سادہ کائنات کو بھی تشکیل دیا۔ اِس طرز کے اشعار میں کہیں کہیں محمد علوی کے انداز کی وہ روایت بھی جنم لیتی ہے، جسے شمس الرحمٰن فاروقی نے اینٹی غزل کا نام دیا ہے۔ لیکن نازکی اپنے شعر یا اپنی غزل کے اسلوب میں بظاہر اینٹی غزل والا عکس رکھنے کے باوجود مفہوم کی وُسعت کو یک رُخی نہیں بناتے۔ استعارے اور علامتی مفہوم کے

وسیع تر دائرے کو پڑھنے والے کے لئے آزادانہ فضا کا حامل بنا دیتے ہیں۔ مثلاً

جونہی بام و در جاگے
بستیوں میں گھر جاگے

آپ ہی کے پہلو میں
رات رات بھر جاگے

ایسا زلزلہ آیا
نیند سے شجر جاگے

—

آپ کی تصویر تھی اخبار میں
کیا سبب ہے آپ گھر جاتے نہیں

اِن اشعار میں فاروق نے نثر کے منطقی مفہوم کے برخلاف مختصر ترین اور سہل ترین اسلوب میں خارج کے بڑے تضادات کو بیان کیا ہے۔ مثلاً پہلے شعر میں بام و در کی بیداری کئی متضاد مفاہیم کا محور نظر آتی ہے۔ ممکن ہے ایک مفہوم یہ ہو کہ سورج کی کرنیں سب سے پہلے بام و در پر دستک دیتی ہیں تب آبادیوں میں اجتماعی بیداری پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے 'بیداری' کی کیفیت کو محض ایک دستک تک محدود رکھا ہے۔ دوسرا شعر غزل کے رسمیاتی مفہوم کی نفی کرتے ہوئے قربت کو وصل یا آسودگی کی بجائے اضطراب کا استعارہ بنا دیتا ہے۔ تیسرے شعر میں ایک اور مابعد الطبیعاتی حقیقت کو منظر نامے کے ذریعہ شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اس شعر میں 'شجر' ساکت و جامد لیکن زندگی آمیز استعارے کو ظاہر کرتا ہے اور زلزلہ، فطری اور غیر فطری انقلاب کی عبارت بن کر نمایاں ہوتا ہے۔

تضادات کے درمیان ایک نئی حقیقت کی بازیافت کا عمل آخری شعر میں نظر آتا ہے۔ جس میں 'اخبار میں چھپی ہوئی تصویر' اور 'گھر نہ جانے والے' شعری کردار کے درمیان اِستفہامیہ معانی کو تشکیل دیا گیا ہے۔

ممتاز ماہر انسانیات اور جدید لسانی علوم کے بانی LEVI STRAUSS لیوی اسٹراس نے اعلیٰ شاعری کی تعریف ایک جملے میں بیان کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے :

POETRY: A SET OF IMAGINARY RESOLUTIONS TO REAL CONTRADICTIONS

فاروق نازکی کے شعر میں یہی تخیلاتی عزائم، اُن کی غزل کے نئے مفہوم اور نئے تصورات کو

اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ غزل کے رسمی اور روایتی عزائم، فن کے دائرے سے اور اظہار کی حدود سے خارج ہو جاتے ہیں۔ صرف چند اشعار سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

کامیابی مرا مقدر کر
زور کے ساتھ مجھ کو زر دیدے

اب فقیری میں کوئی بات نہیں
حشمت و جاہ و کرّ و فر دیدے

تو خدا ہے بجا، مجھ کو ڈراتا کیوں ہے
جا مبارک ہو تجھے تیرے کرم کا سایہ

فاروق نازکی اپنی غزل میں اُس منزل تک بھی پہنچتے ہیں جہاں ذات اور کائنات کا تصادم ایک دوسرے کی شکست و ریخت کا باعث بنتا نظر آتا ہے۔ یہ تصادم در اصل جدید عہد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے عہد کے آسمان پر صرف ستاروں ہی کی نہیں بلکہ سیاروں کی یورش بھی جاری ہے۔ انسانی احساس کو سائنس کی خفیف اور دیو ہیکل ایجادات سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ فلک بوس عمارتوں نے آدمی کے وجود اور اُس کی قامت کو کم اوقات بنا دیا ہے۔ ارتقاء کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ذہن کی صلابت اور سالمیت کو لاتعداد خدشات کا سامنا ہے۔ اس تیز رفتاری میں اقدار کے ساتھ ساتھ اشیاء بھی ٹوٹ رہی ہیں، بکھر رہی ہیں۔ خلاء میں تیرتے ہوتے مہلک مادے انسان اور زمین کے قریب آرہے ہیں۔ سائنس نے مستقبل کا جو منظر دکھایا ہے۔ اُس میں انسانی وجود انتہائی بے معنی اور بے قدر نظر آرہا ہے۔ ٹکراؤ، تصادم اور ذہنی تصادمات کی یہ کائنات، ماضی کے سایہ دار اشجار سے محروم ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کے اس انتشار کو جدید انگریزی شاعری کے بانی W.B. YEATS نے اپنی نظم SECOND COMMING میں بیان کیا تھا۔ لیکن YEATS کی شاعری میں یہ اشارے بھی موجود تھے کہ حضرت مسیح کے بعد دو ہزار برس پورے ہونے پر ایک نیا عہد وجود میں آئے گا جس میں مسیح موعود کی بشارت ہوگی۔ فاروق نازکی بھی اپنے عہد کے تضادات اور انتشار کو اپنے احساس میں سمولئے ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کا المیہ یہ ہے کہ انہیں کسی بشارت کا سہارا میسر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ خود اپنے احساس میں تضادات سے نبرد آزما ہیں اور اس کیفیت کو اپنے اشعار میں ڈھال رہے ہیں کچھ شعر سنئے:۔

اے مرکزِ خیال بکھرنے لگا ہوں میں
اپنے تصوّرات سے ڈرنے لگا ہوں میں

برداشت کر نہ پاؤں گا وحشت کی رات میں
اے شامِ انتظار بکھرنے لگا ہوں میں

بھٹک نہ جاتا اگر ذات کے بیاباں میں
تو میرا نقشِ قدم، میرا راہبر ہوتا

قدروں کی حدیں توڑ، نئی طرح نکال
دم تجھ میں اگر ہے تو بغاوت ہو جا

بھٹکی ہوئی روحوں کو تسلی دے کر
کھوتے ہوئے اجسام کی جنت ہو جا

جنوں آثار موسم کا پتہ کوئی نہیں دے گا
تجھے اے دشتِ تنہائی صدا کوئی نہیں دے گا

سنگ پرستوں کی بستی میں شیشہ گروں کی خیر نہیں
جن کی آنکھیں نور سے خالی ان کے دل ہیں آہن آہن

یہ اشعار، فاروق نازکی کی ذہنی اور تخلیقی کیفیت کا آئینہ خانہ ہیں۔ اس آئینہ خانے میں خوف کی پرچھائیاں بھی ہیں۔ وحشت کی رات بھی اور شامِ انتظار بھی۔ میر نے کہا تھا ؎

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

فاروق نازکی نے ذات کے بیاباں میں اس آئینہ خانے کی تعمیر کی ہے۔ اور جنوں آثار موسموں میں دشتِ تنہائی کی صداؤں کو اپنے شعر کے لئے ایک بازگشت بنا لیا ہے۔ یہ اشعار جدید بلکہ جدید تر غزل کی بہترین مثال کہے جا سکتے ہیں۔

غزل کے اسلوب کو ایک نیا وقار عطا کرنے کی جو جستجو فاروق نازکی نے کی ہے۔ اس کی اگلی منزل، فاروق کی تازہ نظموں میں نمایاں ہوتی ہے۔

نظم کا اسلوب، ہمارے عہد میں بہت سی تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے۔ اردو شاعری کا عالمی

استعارہ، جدید نظم کا مرہونِ منت ہے۔ فاروق نازکی کے پہلے مجموعے میں بھی نظمیں شامل تھیں، تاہم اُن کی تازہ بیاض میں جو نظمیں ہیں ان کی کائنات پہلے سے مختلف ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھی جا سکتی ہے کہ فاروق نے یہ تازہ نظمیں ۱۹۹۰ء اور اس کے بعد کے برسوں میں لکھی ہیں اور وادی کشمیر میں رہ کر ان کی تکمیل کی ہے۔ یہ تمام عرصہ وادی کشمیر میں شدید ترین شورید گی اور خون آشامی کا عرصہ ہے چنانچہ نظموں میں SITUATION کے اثرات تو ہیں لیکن نازکی نے بیرونی حوالے کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہوئے لمحہ موجود سے نکل کر وقت کے اُس محیط دائرے سے رشتہ استوار کیا ہے، جو لمحاتی حقائق کو ابدی حقائق میں بدل دیتا ہے ـــــ اور تخلیق یا نظم اپنے تاریخی اور سماجی تناظر سے نکل کر ابدیت کی جانب نگراں ہو جاتی ہے۔ اس دلیل کو سمجھنے کے لئے فاروق کی نظموں کو DECONSTRUCT کرنا ضروری ہے۔ مثال کے لئے نظم "سنہری دروازے کے باہر" پر غور کیجئے۔ اور پوری نظم کی بجائے SPOTS OF TIME کو یک جا کر لیجئے۔

لرزتے بدن
رنگ کہرے میں لپٹے ہوئے
ادھ مری روشنی کا کفن اوڑھ کر
موت کی سرزمیں میں اُجالوں پہ قربان ہونے سے پہلے
بہت دیر تک
اپنے احساس کی آنچ سہتے رہے
شام
نیم تاریک راہوں پہ ماتھا رگڑتی رہی۔
چاند
آکاش کے گہرے نیلے سمندر میں تاروں کی اندر سبھا سے
بہت دیر تک
موت کی سرزمیں پر اُجالوں کی گل پاشیاں کر رہا تھا

ادھر
بے زباں شہر کی تیرگی میں لرزتے بدن

صلیبوں کے سائے میں دم لے رہے ہیں۔

پوری نظم میں لرزتے بدن، شام، چاند، بے زباں شہر اور صلیبوں کے سائے SPOTS OF TIME ہیں۔ وقت کے یہ داغ، جدید شہر اور جدید معاشرے کی اُس کائنات کو نمایاں کر رہے ہیں۔ جس میں خوف ہے۔ منظر نامہ ہے، زندگی ہے، زیست کا تسلسل ہے اور صلیبوں کے وہ سائے ہیں، جو گذشتگاں[1] کی علامت بن کر لرزتی ہوئی زندگی کو وجود و عدم کا پیغام دے رہے ہیں۔

فاروق نازکی نے "ہماری بات" کے عنوان سے اپنی نظم میں ایک مکمل رزمیہ تخلیق کیا ہے۔ یہ نظم نثری اسلوب میں ہے۔ لیکن نثری منطق کی حامل نہیں ہے۔ اس میں نظم میں ایک DYNAMIC شعری کائنات اور منطق ہے۔ جس کا رشتہ عہدِ نو کے کشمیر سے، کشمیر کی تہذیبی اور ثقافتی روایت ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے آپ کو محسوس ہوگا کہ فاروق نے جدید نظم کی جمالیاتی بنیادوں سے انحراف کیا ہے۔ اور تفسیر و تشریح کی نثری سیاست سے بھی دامن بچایا ہے۔ نظم میں ذات کی بجائے 'ہم' اور 'ہماری بات' کے ذریعہ IMPERSONAL شعری حوالہ تخلیق کیا ہے۔ یہ تمام خصوصیات وہ ہیں جو 'مابعدِ جدید' یا POST-MODERN کلچر اور نقطہ نظر کی بنیاد تصور کی جاتی ہیں۔ نظم بنیادی طور پر ایک منظر نامہ ہے، جس میں کشمیر کا ماضی بھی ہے، اور حال بھی، وہ آرکی ٹائپس بھی، جن کے باعث وادیٔ کشمیر کا ثقافتی کردار ظہور میں آتا ہے۔ نظم میں یہ شکوہ بھی ہے کہ شمالی ہندوستان نے وادیٔ کشمیر کے منفرد آرکی ٹائپ پر توجہ نہیں دی :

"لوگ زبیر رضوی کے علی بن متقی کی بات سنتے ہیں۔
مگر سبز علی سکوتی کا نغمہ نہیں سنتے۔
گو کہ وہ نغمہ آج بھی پیر پنچال کی چوٹیوں سے ٹکرا کر
چٹانوں کی رگوں میں دوڑتا ہے۔
پھر جب برف پگھلتی ہے تو آبشاروں میں اُس کی گونج سُنائی دیتی ہے
سبز علی سکوتی کے نغمے بھی مختلف ہیں۔"

"سبز علی سکوتی" وہ آرکی ٹائپ ہے۔ جس نے وادی کی سرزمین پر سورج اُتارا۔ سورج نے برف کا لبادہ اوڑھ کر پیر پنچال کی چوٹی پر روحانیت کا نغمہ سُنایا۔ 'سبز علی سکوتی' کے آرکی ٹائپ میں، وادیٔ کشمیر کے تصوّف کی تمام روایت ایک محور پر یک جا ہو گئی۔ لیکن وادی کی اس انفرادی روایت کو شمالی ہندوستان نے شناخت نہیں کیا۔ اسی باعث زبیر رضوی کی نظموں کے آرکی ٹائپ 'علی بن متقی' کے تو تذکرے ہوتے لیکن وادیٔ کشمیر کی

---

[1] گزشتگان اثرِ انتظار رکھتے ہیں۔ — غالبؔ

ثقافت اور یہاں کی ادبی روایت سے شمالی ہند یا کشمیر کے باہر کی دُنیا کا رشتہ استوار نہیں ہوا۔

اس نظم کا آخری حصہ نئے پُرانے زمانوں کے درمیان یا کلاسیکی عہد اور جدید عہد کے درمیان ایک عجیب و غریب رِشتے کو تشکیل دیتا ہے۔ نظم کا آخری حِصہ اس طرح ہے :۔

'بہار آئی
مگر پیڑوں پر سیب لگے نہ بگوگوشے
بلکہ انسانوں کی کھوپڑیاں لگ گئیں
ہم بہت خوش ہوتے
اور ہم نے اپنے ہمزادوں کی دعوت کی
اور جنوں کو کاک ٹیل پر بلایا۔'

عجیب اتفاق ہے کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی ایک نظم میں ایسے ہی تصوّر کو بیان کیا تھا۔

'گزشتہ برس تم نے اپنے باغ میں
جن لاشوں کو بویا تھا۔
اب وہ پھل پھول گئی ہونگی اور اُن میں خوشے نکل آتے ہوں گے۔'

ایلیٹ کو بھی اپنے عہد کے تہذیبی اور ثقافتی انتشار کے لئے اور انسانی بے حِسی کے اظہار کے لئے زمین میں بوئی ہوئی لاشوں کا استعارہ ملا تھا اور فاروق کو بھی اس کیفیت کے لئے پیڑوں پر انسانی کھوپڑیوں کی فصل اُگ آنے کا استعارہ میّسر آیا۔

فاروق کی ایک اور قابلِ ذکر نظم ہے "تیزاب آکار خوشبو کا"۔ یہ نظم بھی ایک بڑے المیہ کا اظہار ہے۔ ابدی معصوُمیت کے آغوش سے اپنا سفر شروع کرنے والی زندگی، عہد نو میں پہنچ کر وہ تیزاب بن گئی ہے جس نے معصوُمیت کے چہرے کو، اور اقدار کے حُسن کو داغ دار کر دیا ہے۔ یہ نظم وقت کی دو انتہاؤں کے درمیان سفر کرتی ہے۔ ایک جانب وہ گاؤں ہے جس میں تخلیق اور معصوُمیت بلکہ RADICAL INNOCENCE کی علامت ہے۔ ماں — جو سیب کی طرح سُرخ اور گلاب کی طرح کومل ہے۔ دوسری جانب وقت کا دُوسرا کنارہ ہے جو 'میں' کی علامت میں نمودار ہوا ہے۔ لیکن اپنی شناخت اور صفات سے محروم ہے۔ اسی لئے وہ اپنی کیفیت کو بیان کر دینے کے بعد سوال کرتا ہے کہ 'میں کون ہُوں۔؟' نظم کا یہ حِصّہ خاص طور پر اہم ہے :

'میں بھی اُس کا ایک جہاز ہوں

پتھر چبانا، پلکوں کی جھاڑیوں پر سدرۃ اگانا
صبح سویرے مسجد کے دروازے پر خدا سے
آنکھیں چُرا کر گزر جانا
اور خدا کے محبوب پر فریفتہ ہو کر
خدا سے رقابت بانٹ لینا
اُس کی ادا بن گیا ہے
میں سُرخ میٹھے سیب اور تیزاب کے اسی
امتزاج کی پیداوار ہوں ـــ

میں کون ہوں ؟

یہ نظم پس جدید POST-MODERN فکر کی بڑی بھرپور مثال ہے۔ رولانڈ بارتھر (ROLAND BARTHER) نے اِس نوعیت کے تخلیقی تجربہ کے لئے صرف ایک اصطلاح بنائی ہے جو فاروق نازکی کی نظم پر صادق بھی آتی ہے اور اِس نظم کے بنیادی استعارے کو واضح کر دیتی ہے۔ اس اصطلاح کا اُردو ترجمہ نہیں کرنا چاہتا، اس لئے انگریزی میں ہی تحریر کر رہا ہوں۔

SCHIZOPHRENIC MOOD OF SPACE AND TIME

زمان و مکان کی یہ دیوانہ وار کیفیت فاروق کی دوسری نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ تاہم وہ نظمیں جن پر situation کے اثرات زیادہ ہیں اس دیوانگی خیز شدت کی بجائے اُس شعری کردار کو ظاہر کرتی ہیں، جو زندگی اور موت کے درمیان کسی ویران لمحے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر گذشتہ زمانوں کو اور زندگی کو آواز دے رہا ہے۔ ان نظموں میں 'سُرخیاں' 'ایک مرثیہ اور ـــــ یہ کیسی رُت آئی'، 'جوتے خوں اُبھرتی ہے'، 'مشورہ'، 'ایک نظم جنگلوں کے نام'، '۱۹۹۰ء کی ایک صبح' خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ان میں سے ایک 'سُرخیاں' واقعات، اخبارات اور حقائق کی IRONY کو انتہائی موثر انداز میں پیش کرتی ہے۔ خاص طور پر یہ مصرع:

معصومُ الاسلام کی عظیم موت
والدین کو مجاہدوں کے سربراہ نے
قرآنِ حکیم کا نسخہ پیش کیا۔
جو معصوم کی اَن پڑھ ماں نے مخمل کے غلاف میں

بند کر کے طاق پر رکھ دیا
کھڑکی سے جھانکتی ہوئی ہوا نے کہا
'اقرا'

فاروق نازکی کی نظموں کے مُطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مزاجاً، میراجی اسکول سے زیادہ قریب ہیں۔ کچھ نظموں میں وہی میراجی، جیسی شدّت، کسک اور زمینی تلازمے، اسلوب اور اظہار کی بہار دکھاتے ہیں۔ مثلاً 'منٹو کی سُلطانہ بولی' کا یہ حصہ :

جگ کیا جانے مَن کے اندر کتنے دریا بہتے ہیں
جسم ہمارا اک رستہ ہے، لوگ گزرتے رہتے ہیں
چُپ رہتے ہیں، غم سہتے ہیں اور سدا یہ کہتے ہیں
بھید دلوں کا جو جانے ہے، وہ جوگی کب آئے گا

فاروق نازکی کی ایک اور نظم 'چلّہ کلاں' کا تذکرہ بھی ضروری ہے یہ نظم ایک فلسفیانہ تناظر کی حامل ہے۔ یہ نظم ایک ORGANIC WHOLE ہے، جس میں انسان اور تہذیب کے اِرتقاء اور نشاۃ الثانیہ کے بعد مکمل DESTRUCTION کے حوالے اور تلازمے موجود ہیں۔ اس مکمل تباہی کے بعد حرف کے بطن سے دوبارہ جنم لیتی ہوئی کائنات ہے۔ جو عہدنامۂ عتیق کے اس حوالے کو نمایاں کرتی ہے :

'ابتدا میں حرف تھا، اور خدائے برتر کی ذات
پانیوں پر پرواز کر رہی تھی۔'

ممتاز جدید مفکر اور ناقد GEORGE STAINER نے عہدنامۂ عتیق کے اس حوالے پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ عہدنامۂ عتیق نے یہ تو واضح کر دیا تھا کہ ابتدا میں حرف تھا، لیکن انتہا کیا ہوگی۔ اس کی بشارت فن کار اور خصوصاً شاعر کی ذمہ داری ہے۔

فاروق نازکی نے اس ذمہ داری کا بار اُٹھایا ہے۔ اور چلّہ کلان (چالیس دن کا چلّہ) میں کائنات اور تہذیب کے اسی اِرتقاء، عروج اور تکمیلی منازل کو اپنی نظم کے ذریعہ تشکیل دیا ہے۔ نظم کا ایک اقتباس :-

الف سے پھر اللہ لکھا
ب سے پھر بسم اللہ لکھا
الف اللہ
ب بسم اللہ

ل لکیریں
کیا کیا لکھا، کیا کیا سیکھا
م مقدر
م مزّمل
م منوّر
م سے ماضی
م سے مسجد
م سے مستقبل جب لکھا
رفتہ رفتہ
لفظوں کے پھر چہرے بدلے
پ سے پارہ
پ سے پانی
پ سے پت جھڑ
پ سے پتھر
خوبانی کے پیڑ پہ مارا
اور زمیں پر خوبانی کے ڈھیر لگائے
ننھے ننھے ہاتھوں نے پھر
لفظوں کو معنی پہنائے
ننھے اکھشر
سادہ اکھشر
گول مٹول سے پیارے اکھشر
معنی کے پہناوے پہنے
سُر ساگر کی لہروں جیسے
پتوں پر شبنم کے قطرے
اکھشر رنگ بدلتے اکھشر

بربادی کے ساتے اکھشر
پھول سے جو نازک لگتے تھے
نیزے سے لہرائے اکھشر
گول چناروں کے ساتے میں

صبحیں بدلیں، شامیں بدلیں
راتیں بدلیں، باتیں بدلیں

(چلۂ کلاں)

اس طویل اقتباس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ فاروق نازکی کی نظم کے لئے کسی تشریحی سیاست کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فاروق نے اپنی نظم سے زندگی کی نئی تجدید کا کام لیا ہے۔ یہ نظمیں، ہماری جدید اور جدید تر شاعری کے سفر کا ایک نیا پڑاؤ ہیں۔ ان میں زندگی کی جو برقی لہر موجود ہے اُس کے اطراف میں جدید فلسفوں کی کائنات بکھری پڑی ہے۔ یہ نظمیں خود بھی روشن ہیں اور اس کائنات کو بھی روشنی بخش رہی ہیں۔

محمود ہاشمی

سری نگر —— جون ۹۳ء

حصارِ جانِ و دِل

فاروق نازکی کا شعری سفر گذشتہ پچیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کے ذہنی ارتقا پر برابر میری نظر رہی۔ اس عرصے میں وہ کئی نشیب و فراز سے گذرے کبھی وہ سرگرمی سے تخلیقِ شعر کرتے رہے اور کبھی کاروبارِ حیات میں اتنے منہمک ہو گئے کہ شعر گوئی گھاٹے میں پڑ گئی۔ مزید برآں بعض رسایل کے صفحات پر ان کے کلام کے مطالعے سے، یا شعری محفلوں میں ان کے کلام کو سن کر میں محسوس کرتا رہا کہ وہ خود اظہاریت کی صبر آزما جد و جہد سے گذر رہے ہیں۔ یہ جد و جہد بعض مواقع پر ثمریابی کا خوشگوار تاثر پیدا کرتی رہی، اور گاہے گاہے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ وہ جد و جہد ہی کی نذر ہو جائیں گے۔ تاہم یہ بات قابلِ طمانیت تھی کہ وہ جد و جہد اور حرکت کے مراحل سے مستقل مزاجی سے گذر رہے تھے اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ ان کی حالیہ برسوں کی شاعری دو بنیادی باتوں کا پتہ دیتی ہے، اول، وہ خارجی حقایق اور واقعات کا سامنا کر کے ایک انفرادی ردِ عمل کی بازآفرینی کی سعی کرتے ہیں۔ یہ ایک زیرک، خواب پرست، جذباتی اور معصوم انسان کا ردِ عمل ہے۔ اس سے وہ نئی نسل کے شعرا میں آسانی سے قابلِ شناخت ہو جاتے ہیں۔ وہ فیشن پرستی کے طور پر مروجہ اور رائج الوقت خیالات و احساسات کے بجائے ذاتی محسوسات کو (خواہ ان کی کوئی شکل کیوں نہ ہو۔) بے کم و کاست متشکل کرتے ہیں۔ دوم، وہ مروجہ الفاظ و تراکیب کے بجائے اپنے تجربات کی نوعیت کے مطابق لفظیات کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوتے وہ فارسی تراکیب کے ساتھ ساتھ ہندی کے کومل الفاظ بھی برتتے ہیں.

یہ امر بہر کیف قابلِ ذکر ہے کہ ان کی شاعری سے ایک ایسی تخلیقی شخصیت کی نمود ہوتی ہے، جو خود نگری کے ساتھ ساتھ جہاں بینی کے انداز رکھتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ حسن و جمال کی لطافتوں، نزاکتوں اور رنگینیوں سے بہرہ ور ہے۔ یہ ایک جمالیاتی شخصیت ہے — دلآویز، متحرک، تابناک۔ اس کا حسیاتی پیکر رنگ، روشنی اور خوشبو کی دنیا آباد کرتا ہے۔ یہ دنیا نوخیز گلابوں، چمکتے چشموں، سایۂ اشجار، لرزاں کرنوں نور کے دریاؤں، خوشبو کی پھواروں اور چناروں کے جنگلوں سے منسوب ہے۔

فاروق نازکی کی جمالیاتی شخصیت عہدِ رفتہ کے اِنسان کی مثالی شخصیت ہوتے ہوئے بھی حسیاتی بیداری اور تحرک کا پتہ دیتی ہے۔ اس لئے آج کے انسان کے لئے بھی جاذب توجہ ہو جاتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ وہ آج کے دور کے حیات شکن حالات سے بے خبر نہیں۔ فاروق نازکی خوابوں کو عزیز رکھنے کے باوجود حقیقت کی سنگینی کا احساس رکھتے ہیں۔ وہ حقیقت سے ٹکرا کر مجروح بھی ہوتے ہیں، لیکن خوابوں کے دریچے کے تحفظ کے لئے اپنے دِل وجان کو حِصار بناتے ہیں۔ وہ دل وجان پر وار سہتے ہیں، مگر خوابوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ خوابوں کے تحفظ کا یہ عمل جو رومانی ردِعمل ہے، بہت کم شعراء کے یہاں ملتا ہے۔

حامدی کشمیری

سری نگر ــــ جولائی ۹۳ء

میں ایک گاؤں کا شاعر ہوں
کھلی فضاؤں کا شاعر ہوں

دھوپ میں کھیتی پر لہراؤں
نرم ہواؤں کا شاعر ہوں

میرے دم سے ہیں یہ موسم
دھوپ اور چھاؤں کا شاعر ہوں

صحرا صحرا نام ہے میرا
میں دریاؤں کا شاعر ہوں

سورج میرا رستہ روکے
میں کہ گھٹاؤں کا شاعر ہوں

بہروں کی بستی کا گایک
نابیناؤں کا شاعر ہوں

* * *

گہری نیلی شام کا منظر لِکھنا ہے
تیری ہی زلفوں کا دفتر لِکھنا ہے

کتنے دنوں سے بات نہیں کی اپنوں سے
آج ضرُوری خط اپنے گھر لِکھنا ہے

شِدّت پر ہے ہرے بھرے پتوں کی پیاس
صحرا صحرا خون سمندر لِکھنا ہے

پتھر پر ہم نام کسی کا لِکھیں گے
آئینے پر آذر آذر لِکھنا ہے

چہرہ روشن کھلے ہوئے صحرا کی دھوپ
گہری آنکھیں گہرا ساگر لکھنا ہے

اِس سے آگے کچھ لکھنے سے قاصر ہوں
اِس کے آگے تجھ کو بڑھ کر لکھنا ہے

* * *

جب بھی تم کو سوچا ہے
سارا منظر بدلا ہے

جاتے جاتے یہ کِس نے
نام پَون پر لِکھا ہے

انگاروں کے موسم میں
جِسموں کا سا میلہ ہے

میری بستی میں آکر
پاگل دریا ٹھہرا ہے

خوشیاں ہیں مہمان مری
غم میرا ہمسایا ہے

تم کیا جانو کشمیری
دِلّی میں کیا ہوتا ہے

* * *

جنوں آثار موسم کا پتہ کوئی نہیں دے گا
تجھے اے دشتِ تنہائی صدا کوئی نہیں دے گا

○

تو بھی آجا ساتھ مرے
سُدھریں گے حالات مرے

ٹھنی ٹھنی تیری ہے
کانٹے کلیاں پات مرے

تو پگڈنڈی وادی کی
شہر مرے، قصبات مرے

لا موجود ہے، اللہ ہُو
نفی تری، اِثبات مرے

مہل بستی کی رانی

سن تیکھے کلمات مرے

میں آوارہ پنچھی ہوں

اُڑتے بادل ساتھ مرے

* * *

ستارے بوتی رہیں نیند سے تہی آنکھیں

ادھر یہ حال کہ دامن بھی تر نہیں ہوتا

گوشت کا نغمہ گائے گا
خود سے جب شرمائے گا

موتی چُن لے گا سکھ کے
آنچل میں چمکائے گا

جو بوئیں گے، کاٹیں گے
جو کھوئے گا، پائے گا

مینہہ بَرسے گا جاڑے میں
اور مصیبت لائے گا

موج کرے گا من موجی
جب پی کر لہرائے گا

سورج، دھرتی، پوَن، چکور
ہر کوئی مر جائے گا

مٹی عظمت لکھے گی
ساگر گیت سُنائے گا

پیار، دُلار سے سمجھیں گے
جب کوئی سمجھائے گا

* * *

رنگ خاکے میں نیا بھر دوں گا میں
دشمنوں سے دوستی کر لوں گا میں

پھر نہیں آنے کا خوابوں میں ترے
شہر سے تیرے اگر جاؤں گا میں

میں بہت ضدی ہوں لیکن جانِ من
تو بلائے تو ضرور آؤں گا میں

ہے تضادوں کا چمن میرا وجود
فصلِ گل کا مرثیہ گاؤں گا میں

کانچ کے الفاظ کاغذ پر نہ رکھ
سنگِ معنی بن کے ٹکراؤں گا میں

راستے کے واسطے اِک جام دو
نیم شب ہے اَب تو گھر جاؤں گا میں

* * *

دوشعر

بادِ صبا سے بات کروں، سوچتا ہوں میں
دامن پہ آنسوؤں سے لکھوں سوچتا ہوں میں

میں اس کو بھول جاؤں نہیں میرے بس کی بات
اب اس کی آرزو نہ کروں سوچتا ہوں میں

○

مشورہ دینے کی کوشش تو کرو
میرے حق میں کوئی سازش تو کرو

جب کسی محفل میں میرا ذکر ہو
چُپ رہو، اتنی نوازش تو کرو

میرا کہنا حرفِ آخر بھی نہیں
میری مانو، آزمائش تو کرو

خود ستائی شیوۂ ابلیس ہے
نذرِ حق حرفِ ستائش تو کرو

چار سو ظلمت کے پہرے دار ہیں
رحمتوں کی ہم پہ بارش تو کرو

* * *

غم کی چادر اوڑھ کر سوتے تھے کیا
رات بھر میرے لئے روئے تھے کیا

چادرِ عصمت کے دَھبّے آپ نے
رات پی کر صبحدم دھوئے تھے کیا

میں نے پوچھا اُن سے اک سادَہ سوال
خار میری راہ میں بوئے تھے کیا

ڈھونڈتے پھرتے ہو خود کو نازکیؔ
انہی گلیوں میں کبھی کھوئے تھے کیا

* * *

نام اس کا جہاں جہاں لِکھنا
بے وفائی کی داستاں لِکھنا

اُس کے چلنے کا ذکر جَب آئے
موجِ دریا رَواں دَواں لِکھنا

چاند بستی میں پھول سونے کے
اَب بھی کھِلتے ہیں، مہرباں لِکھنا

میں ہوں مضطر بَدن کی نگری میں
میرے حِصّے میں لامکاں لِکھنا

رات میں آگ بھی برستی ہے
میرے سر پر بھی سائباں لِکھنا

* * *

○

وہی میں ہوں وہی خالی مکاں ہے
مرے کمرے میں پورا آسماں ہے

دیارِ خواب و چشمِ دل فگاراں
جزیرہ نیند کا کیوں درمیاں ہے

سکوتِ مرگ طاری ہر شجر پر
یہ کیسا موسمِ تیغ و سناں ہے

چمن افسردہ، گل مرجھا گئے ہیں
خزاں کی زد پہ سارا گلستاں ہے

بھلا دی آپ نے بھی وہ کہانی
محبّت جس کے دم سے جاوداں ہے

* * *

○

وہ جب سے حال میں شامل ہوا ہے
مرا قصہ کسی قابل ہوا ہے

کوئی اتنا بدل سکتا ہے، کیسے
اُسے پہچاننا مشکل ہوا ہے

ہزاروں خواب دیکھے جاگتے ہیں
سحر خیزی سے کیا حاصل ہوا ہے

مجھے پہچانتی ہے ساری دنیا
وہ جب سے رونقِ محفل ہوا ہے

میں اپنے حوصلے خیرات کردوں
کسی کا نقشِ پا منزل ہوا ہے

* * *

یہی اِلزام ہے دنیا کا ہم پر
کہ ہم رکھتے نہیں قابو قلم پر

نہ پوچھو کس لئے بے رنگ سے ہیں
نہیں ہوتے وہ آمادہ سِتم پر

نویدِ صبح چہرہ گیسوؤں میں
غمِ دنیا کا سایہ چشمِ نم پر

ہمارے حال سے ہمدردیاں کیوں
کہیں حرف آنہ جائے محترم پر

* * *

میں چھوڑ آیا تھا اپنے گھر کو، مگر اُسی کے خیال میں ہوں
نقوشِ پائے ہوا نہیں ہوں، میں اپنے ماضی کے حال میں ہوں

بلندیوں پر قیام میرا، ہر ایک بستی میں نام میرا
میں ہر زمانے کی آبرو ہوں، عروج میں ہوں زوال میں ہوں

حصارِ خوف و ہراس میں ہے بتانِ وہم و گماں کی بستی
مجھے خبر ہی نہیں کہ اب میں جنوب میں یا شمال میں ہوں

یہاں سے نکلوں تو جان لوں گا، مگر اسیری میں جب تلک ہوں
مجھے بھی اِذنِ جواب دیدے کہ قید اپنے سوال میں ہوں

یہاں کسی کو خبر نہیں ہے کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
اُسی کی چشمِ کرم ہے مجھ پر کہ مست خود اپنے حال میں ہوں

* * *

جونہی بام و در جاگے
بستیوں میں گھر جاگے

انجم و قمر جاگے
آسمان پر جاگے

آپ ہی کے پہلو میں
رات رات بھر جاگے

ایسا زلزلہ آیا
نیند سے شجر جاگے

رت جگے سے ڈرتے ہیں
ناز کی مگر جاگے

* * *

○

گفتگو میں بہار کی باتیں
عشق میں کاروبار کی باتیں

ہم کو خود پر بھی اعتبار نہیں
ہم سے کیا اعتبار کی باتیں

دسترس سے تمہاری باہر ہیں
کیف کی اور خمار کی باتیں

چاند سورج زمین کس کے ہیں
حاصل و مستعار کی باتیں

صحنِ گلشن میں پتّے پتّے سے
کیجیے کِردگار کی باتیں

آگہی کے وِشال ساگر میں
گوھرِ تابدار کی باتیں
* * *

آرزو موت کی جو کرتا ہوں
زندگانی پہ پیار آتا ہے
کِس کو چھوڑوں کسے پسند کروں
اسی الجھن میں وقت جاتا ہے

○

نئی باسی کوئی خبر دیدے
سچی جھوٹی کہ معتبر دیدے

سنگ برسا دے میرے آنگن میں
رہروؤں کو گل و ثمر دیدے

ہے فلک تک فصیلِ نارِ جحیم
اے خدا! اب تو ابرِ تر دیدے

کامیابی مرا مقدر کر
زور کے ساتھ مجھ کو زر دیدے

تابناکی عطا ہو فرقت کو
کاسۂ چشم میں گہر دیدے

اب فقیری میں کوئی بات نہیں
حشمت و جاہ دگر دو فر دیدے
* * *

کیا ملا تجھ کو ہمیں بے سر و ساماں کر کے
شہرِ گُل ریز کو اس طرح بیاباں کر کے

○

شہر سارا ہی کربلا سا تھا
جو بھی تھا خون ہی کا پیاسا تھا

اجنبی رات کی سیاہی میں
کوئی تو میرا آشنا سا تھا

تیرے حصّے میں راحتیں ساری
میرے حصّے میں اک دِلاسا تھا

مجھ کو حیران کر گیا فاروقؔ
وہ جو اِک شخص دیوتا سا تھا
* * *

○

اِتنی خراب صورتِ حالات بھی نہیں
جو کہہ نہ پاؤں ایسی کوئی بات بھی نہیں

سورج کا گاؤں جس کی جٹاؤں میں تھا اسیر
اے شہرِ بے چراغ یہ وہ رات بھی نہیں

پھر آج اُٹھ رہا ہے دُھواں دِل کے آس پاس
تجدیدِ آرزوئے ملاقات بھی نہیں

ڈرتا ہوں اپنے سائے سے میں خود گزیدہ ہوں
سینے میں کوئی شورشِ ظلمات بھی نہیں

فاروقؔ نازکی نے کھلائے لہو کے پھول
دِل پر اگرچہ اُس کی عنایات بھی نہیں

* * *

○

نوکِ خنجر روز لکھ لیتی ہے اِک دفتر نیا
صبح لے آتی ہے اپنے ساتھ پھر محشر نیا

دیکھتے ہی دیکھتے بستی میں لگ جاتی ہے آگ
روز لُٹ جاتا ہے کوئی مسکراتا گھر نیا

سنگ باری کے لئے موسم نہیں مخصوص اب
سنگ باری ڈھونڈ لیتی ہے ہمیشہ سر نیا

روشنی آئے بھی کیسے میرے ماتم خانے میں
جن کے بوسیدہ دریچوں میں لگا ہے دَر نیا

صورتِ حالات کے بارے میں کیا لکھوں میاں
کوئی منظر ناز کی صاحب نہیں منظر نیا

* * *

○

نہ ان کو چین گلیوں میں نہ گھر میں
پریشاں حال پھرتے ہیں نگر میں

وطن کی آبرو پر مِٹنے والے
نیا سودا نہیں کیا کوئی سَر میں

میں خالی ہاتھ نِکلا تھا سفر پر
بس اُن کی یاد تھی رختِ سفر میں

تمہارا نام لے کر آج ہم کو
پُکارا کِس نے راہِ پُر خطر میں

غمِ دَوراں سے نپٹوں گا تو خود ہی
غمِ جاناں سے پاؤں گا مفر میں

* * *

پھر پہاڑوں سے اُتر کر آئیں گے
راہ بھٹکے نوجواں گھر آئیں گے

جن کی خاطر ہیں گھروں کے دَر کھُلے
صبح کے بن کر پیمبر آئیں گے

پھر تلاطم خیز ہے دریائے خوں
ہم تری تقدیر بن کر آئیں گے

دوستو! مت سیکھئے سچ بولنا
سَر پہ ہر جانب سے پتھر آئیں گے

ہاتھیوں کی زد پہ ہے کعبہ مرا
کب ابابیلوں کے لشکر آئیں گے

* * *

○

اب کبوتر بام پر آتے نہیں
شوخ پنچھی پیڑ پر گاتے نہیں

شہر سُونا، راستے ویران ہیں
لوگ اب آتے نہیں جاتے نہیں

آپ کی تصویر تھی اخبار میں
کیا سبب ہے آپ گھر جاتے نہیں

نازکیؔ سے شعر کہنا سیکھئے
جو غزل کہتے ہیں، چھپواتے نہیں

* * *

اُجالوں کے پجاری گا رہے تھے
ہمارے گھر جَلاتے جا رہے تھے

بہَار آئی تھی گلزارِ وطن میں
جنوں کے دن، ہمیں یاد آ رہے تھے

تقدس لُوٹ کر خلوت کدوں کا
ہماری جلوتوں پر چھا رہے تھے

لٹے بازار میں عصمت کے موتی
ہم اپنے آپ سے شرما رہے تھے

خس و خاشاک کی مانندِ انسان
وِتستا میں بہلئے جا رہے تھے

* * *

چند لمحوں میں ڈھہ گیا سب کچھ
پانی ہو ہو کے بہہ گیا سب کچھ

تیری نگری میں خالی ہاتھ آئے
راستے ہیں ہی رہ گیا سب کچھ

باز آنکھوں کا اِک قلندر تھا
جو اشاروں میں کہہ گیا سب کچھ

پہلی بارش سے برف موسم تک
میں اکیلا ہی سہہ گیا سب کچھ

میں نے پوچھا تری متاعِ حیات
بولا جہلم کہ بہہ گیا سب کچھ

* * *

صبح کے نور کا پانی تھا قلم کا سایہ
جونہی قرطاس پہ اترا تھا صنم کا سایہ

تو خدا ہے تو بجا، مجھ کو ڈراتا کیوں ہے
جا مبارک ہو تجھے تیرے کرم کا سایہ

اور پھر ہوتا ہے میخانہ کا خورشید طلوع
پھیل جاتا ہے جونہی دیر و حرم کا سایہ

میں تو اس شہر کی گرمی سے جھلس ہی جاتا
ساتھ رہتا نہ اگر میرے ہی غم کا سایہ

آب اَب تیغ نِگہ کو کوئی کیسے دیدے
تیرگی پی چکی، دیدۂ نم کا سایہ

نام کے ساتھ ہی پیکر بھی بَدل دیتا ہوں
مرے ہمراہ ہے ہر ایک جسم کا سایہ

* * *

○

تیری مرضی، نہ دے ثبات مجھے
بے یقینی سے دے نجات مجھے

اُن کی نظریں اٹھیں مری جانب
یاد ہے پہلی واردات مجھے

ہر بلا سے رہے گا تو محفوظ
اِس سفر میں جو رکھ لے ساتھ مجھے

روز ملتا ہوں میکدے میں اِسے
خوب پہچانتی ہے رات مجھے

میں تجھے جانتا ہوں ہرجائی
کیوں بتاتا ہے اپنی ذات مجھے

مجھ کو دیتی ہے ڈال ڈال ہوا
چھاؤں دیتے ہیں پات پات مجھے

* * *

وہ بھی دن تھے آپ سے میری شناسائی نہ تھی
جان لیوا اتنی الجھن، ایسی تنہائی نہ تھی

○

اپنی غزل کو خون کا سیلاب لے گیا
آنکھیں رہیں کھلی کی کھلی خواب لے گیا

شب زندہ دار لوگ اندھیروں سے ڈر گئے
صبحِ ازل سے کون تب و تاب لے گیا

عریاں ہے میری لاش حقیقت کی دھوپ میں
وہ اپنے ساتھ یادوں کا برفاب لے گیا

آیا مرے قریب گلِ سیم تن کی طرح
سارا سکون صورتِ سیماب لے گیا

مجھ کو سپردِ تشنگیٔ روح کر گیا
وہ اپنے ساتھ بزم سے مئے ناب لے گیا

* * *

میری آوارگی کو آبرو دے
خدارا اب تو دادِ جستجو دے

اگر تقدیر غافل ہے تو کیا غم
مرے دِل کو نشاطِ آرزو دے

بڑھا دے اپنے منظر تاب جلوے
جوابِ مہرِ تاباں دوبدو دے

ہمیں پہچانتے ہیں لوگ تجھ سے
توجہ ہم پہ بھی اپنی کبھو دے

خزاں آئی ہے گلشن سوکھتے ہیں
گریباں چاک ہوں اذنِ رفو دے

* * *

○

پیپل کے پتے پر لکھا نام تمہارا کس نے، بولو
پھول رُتوں تک پہنچایا پیغام تمہارا کس نے، بولو

ہونٹوں کا امرت پیتے ہی جاگ اٹھے جو سوتے تھے
زہر بھرا پی ڈالا لیکن جام تمہارا کس نے، بولو

صحرا صحرا کس نے بانٹے رشد و ہدایت کے یہ موتی
گلشن گلشن پہنچایا الہام تمہارا کس نے، بولو

آدم اور حوّا کا قصّہ، ممنوعہ ٹہنی کا وہ پھل
اپنے سر پر جھیلا ہے الزام تمہارا کس نے، بولو

* * *

○

پوچھتے کیا ہو صورتِ حالات
شہر ہے اور یورشِ صدمات

صبح بٹتی ہے، شام بٹتی ہے
درد کی بھیک، زخم کی خیرات

بدحواسی کی بھیڑ میں کیسے،
کس کا چہرہ کرے گا کون شناخت

نوکِ خنجر پہ تھم گیا سورج
رتجگے سے ملی ہے یہ سوغات

بات تشکیک، رمز انداز
قصرِ تخییل میں مکیں خدشات

بے یقینی ہے چشمِ حیراں میں
دِل میں کچھ بھی نہیں بجز شبہات

روز اِک حادثہ گزرتا ہے
قہر اس شہر پر بپا دن رات

* * *

جب کوئی نوجوان مرتا ہے
آرزو کا جہان مرتا ہے

○

میرے چہرے کی سیاہی کا پتہ دے کوئی
آئینے میرے مقابل سے ہٹا دے کوئی

دشت در دشت یہاں پھیل رہے ہیں سائے
شہرِ گلریز سے پھر مجھ کو صدا دے کوئی

عالمِ یاس میں خوابوں میں اترنا تیرا
جیسے بیمار کو جینے کی دعا دے کوئی

مرگِ انبوہ میں اب جشن کا پہلو بھی نہیں
آسماں آخری منظر تو دکھا دے کوئی

* * *

میرے دھڑ سے ہوا ہے مرا سر الگ
اب کرو میری گردن سے خنجر الگ

میری تقدیر میں دونوں لکھے گئے
تم نے کیوں کر لئے پھول پتھر الگ

دھوپ حالات کی سینک لی تو ہوا
میری آنکھوں سے خوابوں کا منظر الگ

جب تلک دم میں دم تھا مرے ساتھ تھے
اب مرے دوست ... رہتے ہیں اکثر الگ

* * *

ہم کون سی منزل سے آئے تھے، بتا دینا
تم پیار کے زینوں سے اُترے تھے، بتا دینا

چمکے تھے گلستاں میں شبنم کی طرح جب ہم
خوشبو کی طرح کیسے بکھرے تھے، بتا دینا

ہر برگِ گُلِ تر میں تنویر کے دھارے تھے
کِس نور کی وادی میں ٹھہرے تھے بتا دینا

جن خانہ بدوشوں سے آباد ہیں ویرانے
کب شہر کی گلیوں سے گذرے تھے، بتا دینا

فاروق کی خاطر سب اس سال بہاراں ہیں
اے نکہتِ خوابیدہ آئے تھے، بتا دینا

* * *

کس سے کروں میں اُن کی شکایت، آج بھی ہیں حالات وہی
ترکِ تعلق کرنے پر بھی ہیں میرے جذبات وہی

گہری آنکھوں کے ساغر میں خواب کے لاکھوں موتی تھے
نیند ہوئی آنکھوں سے اوجھل، دل میں ہے ظلمات وہی

آنگن آنگن خوف کی بارش، دامن دامن شعلے ہیں
دن چڑھتے ہی مِل جاتی ہے، زخموں کی سوغات وہی

شہرِ تمنّا لوٹنے والو، آنے والے کل سے ڈرو
جیت کا دِن جس نے دیکھا ہے، کل کھاتے ہیں مات وہی

جیسے جیسے سورج ڈوبا، مئے خانہ بیدار ہوا
برفیلے ٹیلوں پر اُتری کرنوں کی بارات وہی

کب میری فطرت بدلی ہے، اب بھی ہے خطروں سے پیار
آج بھی اسی گلشن کے اندر جال وہی اور گھات وہی

* * *

آج دل بے قرار سا کیوں ہے
بے سبب انتظار سا کیوں ہے
ہے ابھی دیر شام ہونے میں
آنکھ میں یہ غبار سا کیوں ہے

○

عقیدت کی دیوار کچی نہیں
یہ وہ ریت ہے جو بکھرتی نہیں

ہوا یوں تو چلتی ہے برسات میں
مگر میرے آنگن میں آتی نہیں

محبت کو آساں نہ سمجھو میاں
یہ وہ باڑھ ہے جو اُترتی نہیں

نئی جنوری کو یہ کیا ہو گیا
کہ کھُل کر کبھی برف گرتی نہیں

لہو رنگ سارا نگر ہو گیا
زمیں بارشوں کو ترستی نہیں

کھلی آنکھ تو چار سو برف ہے
برستی ہے لیکن گرجتی نہیں

* * *

ہر سمت ہیں لاشوں کے لگے ڈھیر یہاں
اے دستِ قضا عام ہے اندھیر یہاں
ظالم کا یہاں نام بہت اونچا ہے
مظلوم ہی مظلوم ہوئے زیر یہاں

○

ہم پہ نازل ترا عذاب ہوا
شہر سارا ہی زیرِ آب ہوا

باپ تیری مَدد سے بچ نکلا
ایک بیٹا تھا جو خراب ہوا

ناز بَردار ہم ہی تیرے تھے
ہم پہ کیوں بَند تیرا باب ہوا

جس نے جی جان سے تجھے چاہا
کیوں وہی موردِ عتاب ہوا

میری آنکھوں کے سامنے فاروقؔ
ایک ذرّہ تھا، آفتاب ہُوا

* *

اپنی زمین اپنے گلِستان جَلا دئے
اَپنے بَدن کے آپ نے مینار ڈھا دئے

ہم نے وطن کی مانگ میں سِندور بھر دیا
وحشت کے پھول اپنے لہُو سے کھِلا دئے

ہَم نے تمہاری راہ میں آنکھیں بِچھائی تھیں
تم نے ہماری راہ میں کانٹے بچھا دئے

کیسا عجیب شغل تھا فرقت کی رات میں
میں نے دئیے بنائے، جلائے بُجھا دئے

* * *

بستی سے دُور جا کے کوئی رو رہا ہے کیوں
اور پوچھتا ہے شہر ترا سو رہا ہے کیوں

رُسوائیوں کا ڈر ہے نہ پُرسش کا خوف ہے
دامن سے اپنے داغِ وفا دھو رہا ہے کیوں

کیا لذّتِ گناہ سے دل آشنا نہیں
شرمندہ میرے حال پہ تو ہو رہا ہے کیوں

وہ اُن کی دلفریب دِلآرائیاں کہاں
ماضی کے خواب زار میں اب کھو رہا ہے کیوں

فاروقؔ جی کا کب کوئی پُرسانِ حال تھا
تنہائیوں کے غار میں دِل رو رہا ہے کیوں

* * *

فسانہ اپنی تباہی کا پھر سُناتا ہے
وہ اپنا زورِ بیاں مجھ پہ آزماتا ہے

کبھی نظر بھی مِلاتا نہیں ہے وہ ہم سے
ہماری راہ میں پلکیں کبھی بچھاتا ہے

عجیب شخص ہے باہر کبھی نہیں آتا
اکیلا گھر میں ہے ہر شب دیئے جلاتا ہے

تمام شہر میں کوئی نہیں ہے اُس جیسا
وہ دوسروں کا نہیں اپنا دِل دُکھاتا ہے

وہ جب جاتا ہے ہو جاتی ہے اُداس نظر
وہ جب بھی آتا ہے طوفان سا اٹھاتا ہے

* * *

اے مرکزِ خیال بکھرنے لگا ہوں میں
اپنے تصوّرات سے ڈرنے لگا ہوں میں

اِس دوپہر کی دھوپ میں سایہ بھی کھو گیا
تنہائیوں کے دِل میں اُترنے لگا ہوں میں

بَرداشت کر نہ پاؤں گا وحشت کی رات کو
اے شامِ انتظار بپھرنے لگا ہوں میں

اِس تیرگی میں کرمکِ شب تاب بھی نہیں
تاریکیوں کو روح میں بھرنے لگا ہوں میں

اَب دل میں تیری یاد کی اِک شمع تک نہیں
تاریک راستوں سے گزرنے لگا ہوں میں

* * *

○

کسی کی زلف کا قصّہ جو مختصر ہوتا
شبِ فراق کو اندیشۂ سحر ہوتا

بھٹک نہ جاتا اگر ذات کے بیاباں میں
تو میرا نقشِ قدم میرا راہبر ہوتا

کبھی نہ رُکتا کوئی پا شکستہ میرے قریب
جو سنگِ میل نہیں سنگِ رہ گزر ہوتا

اگر میں ہار نہ جاتا خود اپنے ہی ہاتھوں
تمہارا داؤں کبھی کوئی کارگر ہوتا ؟

فصیلِ شب سے مرے روشنی کے آنگن میں
ہمارے ساتھ کبھی آپ کا گزر ہوتا

* * *

سحر ہوئی تو طبیعت مری پھڑک اٹھی
رگوں میں ساز بجے بے خودی دھڑک اٹھی
چلی ہوا تو عجب حال ہو گیا میرا
مرے وجود میں اک آگ سی بھڑک اٹھی

○

تفسیرِ شبِ تار محبت ہو جا
روپوش نہ رہ صبحِ سعادت ہو جا

اڑتے ہوئے لمحوں کو پکڑنا ہے اگر
خلوت سے نکل صاحبِ جلوت ہو جا

قدروں کی حدیں توڑ نئی طرح نکال
دم تجھ میں اگر ہے تو بغاوت ہو جا

دیرینہ روش چھوڑ صنم سازی کی
ہاں خالقِ نو طرزِ محبت ہو جا

بھٹکی ہوئی روحوں کو تسلی دے کر
کھوتے ہوتے اجسام کی جنت ہو جا

تو صاحبِ اقلیمِ سخن ہے فاروق
اَب بندۂ اقلیمِ ولایت ہو جا

* * *

مرے نصیب کو خوابوں کا کاروبار نہ دے
مجھے شراب کی توفیق دے، خمار نہ دے
مرے دماغ کو نیندوں کا بن مبارک ہو
مری نگاہ کو تکلیفِ انتظار نہ دے

ہاتھ ہمارے ساتھ نہ دیں گے کب ہم نے سوچا تھا ایسے
آزادی حالات نہ دیں گے کب ہم نے سوچا تھا ایسے

پھولوں کی دنیا کے باسی، جن کی بہاریں بارہ ماسی
کانٹوں کی سوغات نہ دیں گے کب ہم نے سوچا تھا ایسے

میٹھی رُت کے وہ سوداگر، پیلے موسم میں یاد آ کر
دل کو نئے صدمات نہ دیں گے کب ہم نے سوچا تھا ایسے

ساگر ساگر جن کے چرچے، ساحل ساحل جن کے پرچے
موجوں کی خیرات نہ دیں گے کب ہم نے سوچا تھا ایسے

* * *

سختیٔ راہِ طلب سے لوگ کیوں ڈرنے لگے
حوصلے ہیں پا شکستہ، ولولے مرنے لگے

موسمِ پندِ شکیبائی نہ وہ فصلِ سکوں
بات کیا ہے گھاؤ دِل کے بے سبب بھرنے لگے

مجھ کو لگتا ہے محبت در بدر ہو جائے گی
فلسفے اہلِ خرد کے دل میں گھر کرنے لگے

رہ گئے تیوری چڑھا کر، منہ سے کچھ بولے نہیں
اِک ذرا سی بات کو بھی مختصر کرنے لگے

جو مری کابوس خوردہ رات کے ہمراز تھے
وہ مرے احساس کے آسیب سے ڈرنے لگے

* * *

○

عجیب رنگ سا چہروں پہ بے کسی کا ہے
چلو سنبھل کے یہ عالم روا روی کا ہے

کبھی نہ بات زمانے نے دل لگا کے سُنی
یہی تو خاص سبب میری بے دِلی کا ہے

سنا ہے لوگ وہاں مجھ سے خار کھاتے ہیں
فسانہ عام جہاں میری بے بسی کا ہے

* * *

حصارِ جسم سے آگے نکل گیا ہوتا
جنوں کی آگ میں دیوانہ جل گیا ہوتا

حیات ایک سہی، کائنات ایک سہی
ہمارے عہد کا انساں بدل گیا ہوتا

ہوا کے زور نے پتھر اڑا دئے ہوتے
تمام شہر کو طوفاں نگل گیا ہوتا

میں اپنی نیند کسی گھر میں کیسے بھول آتا
وہ میرے خواب کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا

نہ پوچھ کیسا تھا منظر تری جُدائی کا
فرشتہ ہوتا تو وہ بھی دہل گیا ہوتا

* * *

○

دَرد کی رات گزرتی ہے مگر آہستہ
وصل کی دھُوپ نکھرتی ہے مگر آہستہ

آسمان دُور نہیں، ابر ذرا نیچے ہے
روشنی یوں بھی بکھرتی ہے مگر آہستہ

تم نے مانگی ہے دُعا ٹھیک ہے خاموش رہو
بات پتھر میں اُترتی ہے مگر آہستہ

تیری زلفوں سے اِسے کیسے جُدا کرتا میں
زندگی یوں بھی سنورتی ہے مگر آہستہ

* * *

صبح اٹھتے ہی کیا دُعا مانگوں
اپنی مایوسیاں فزوں کردوں

کیوں گرفتارِ ماہ و سال کیا
میں بھی تجھ سے اگر سوال کروں

دامنِ شب پہ نوکِ خنجر سے
اِک نیا آفتاب لکھتا ہوں

مجھ سے کیا پوچھتے ہو نام، پتہ
میں تو بس آپ کا ہی سایہ ہوں

اپنی پہچان کھو گیا ہوں میں
کِس کی محفل سے اُٹھ کے آیا ہوں

ساری بستی جلا کے رکھ دوں گا
اپنے گھر کو تو میں جلا ڈالوں

کہنے والے سے یہ گزارش ہے
بات دلچسپ ہو تو میں بھی سنوں

* * *

سرسراہٹ ہے شاخساروں میں
گھونسلہ ہے کوئی چناروں میں

دل دھڑکتے ہیں لالہ زاروں کے
آگ لگتی ہے جب چناروں میں

آسماں آنکھ سے ہوا اوجھل
پھر پرندے اُڑے قطاروں میں

برف پگھلی تھی پیڑ جاگے تھے
اب کے آیا مزا بہاروں میں

ہم بھی سینے میں داغ رکھتے ہیں
ہم بھی شامل ہیں لالہ زاروں میں

میں نے آنکھوں میں رات کاٹی ہے
دِن گزارا ہے خواب زاروں میں

موسموں کی حسین شہزادی
چھُپ گئی میرے استعاروں میں

پچھلے موسم میں رنگ برسے تھے
اب کے دم ہی نہیں نظاروں میں

گھِر گئی لڑکیوں میں وہ فاروق
جس طرح چاند ہو ستاروں میں

* * *

اُن نینن کے صدقے جاؤں، جو برسیں ہیں ساون ساون
پائے طلب ہے صحرا صحرا، دستِ جنوں ہے دامن دامن

ایسا ویسا کھیل نہیں ہے، پریت کی بازی، آگ کا دریا
پربت بہتے پانی بن کر، سورج اُگتے آنگن آنگن

شہر کے ہنگاموں میں اکثر کھو جاتا ہے میرا چہرہ
تنہائی کے تاج محل میں میرا چہرہ درپن درپن

چاک گریباں خاک بسر ہیں، ہم سے لاکھوں اس نگری میں
تیرے فیض سے پھر بھی اپنا نام ہوا ہے گلشن گلشن

سنگ پرستوں کی بستی میں شیشہ گروں کی خیر نہیں
جن کی آنکھیں نور سے خالی، اُن کے دل ہیں آہن آہن

شہر کو چھوڑا بن میں آئے، سوچا تھا بسرام کریں
آنکھ لگی تم دھیان میں آئے، پھر ہم تھے اور الجھن الجھن

مصحفیؔ کامل کی زمیں میں ہم نے بھی کچھ کاوش کی ہے
دیکھ غزل فاروقؔ ہماری رنگیں رنگیں روشن روشن

* * *

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالبؔ

سنہری دروازے کے باہر

لرزتے بَدن
رنگ کہرے میں لپٹے ہوئے
ادھ مری روشنی کا کفن اوڑھ کر
موت کی سرزمیں میں اُجالوں پہ قربان ہونے سے پہلے
بہت دیر تک
اپنے احساس کی آنچ سہتے رہے ۔

شام
نیم تاریک راہوں پہ ماتھا رگڑتی رہی
- کانپتی تھرتھراتی، شبِ غم کے سانچے میں ڈھلنے سے پہلے
بہت دیر تک
- سردفانوس کے پاس ٹھٹھری رہی۔

- چاند،
آکاش کے گہرے نیلے سمندر میں تاروں کی اندر سبھا سے
بہت دیر تک
موت کی سرزمین پر اُجالوں کی گلپاشیاں کر رہا تھا۔
لحد تا لحد، کوئی سایہ نہ خاکہ
قدم تا قدم، منزلوں کے نشاں گُم

مکینوں سے خالی مکانوں کے دَر
تختیاں رہنے والوں کے ناموں کی لے کر
بہت دیر تک منتظر تھے مگر
کوئی دستک نہ آہٹ

اِدھر
بے زباں شہر کی تیرگی میں
لرزتے بدن
کیف وکم کے بَدلتے ہوتے زاویوں میں
الجھتے، چھلکتے، بکھرتے، سِمٹتے رہے

اور
کُہرے میں لپٹے ہوتے
شاخ در شاخ روشنی سے گذر کر
صلیبوں کے سائے میں دم لے رہے ہیں۔

*

بچپن

جَب ہلکی پھلکی باتوں سے
نغموں کی طنابیں بنتی تھیں
جَب چھوٹے چھوٹے لفظوں سے
افکار کی شمعیں جلتی تھیں

ہر چہرہ اپنا چہرہ تھا
ہر دَرپن اپنا دَرپن تھا
جو گھر تھا ہمارا ہی گھر تھا
ہر آنگن اپنا آنگن تھا

جو بات لبوں تک آتی تھی
وہ دِل سے نِکل کر آتی تھی
کانوں میں امرت بھرتی تھی
اور دِل کو چھو کر جاتی تھی

وہ وقت بہت ہی پیارا تھا
وہ لمحے کِتنے میٹھے تھے

جس وقت کی اُجلی راہوں پر
آغاز تو ہے انجام نہیں
وہ وقت کہاں روپوش ہوا
جس وقت کا کوئی نام نہیں

*

اور میں چُپ رہا

میرے ہاتھوں سے میری چِتا بن گئی
میرے کاندھوں پہ میرا جنازہ اٹھا
نوکِ مژگاں سے قرطاسِ ایّام پر
میرے خوں سے مرا نام لِکھا گیا

اور میں چُپ رہا

میرے بازار کوچے، مرے بام و دَر
میری ناداریوں سے سجائے گئے
میرے افکار، میری متاعِ ہُنر
میری محرومیوں سے بسائے گئے

اور میں چُپ رہا

میری تقدیر کا جو بھی خاکہ بنا
پیلے موسم کے پتوں پہ لکھا گیا
میری تصویر مجھ سے چھپائی گئی
مجھ کو نادیدہ خوابوں میں دیکھا گیا

اور میں چپ رہا

میرے الفاظ معنی کی تلوار سے
سر بریدہ ہوئے گنگناتے رہے
میرے نغمے گداؤں میں بانٹے گئے
برگزیدہ ہوئے گنگناتے رہے

اور میں چپ رہا

مجھ سے میری تمنّا کے گُل چھین کر
زرد موسم نے جشنِ بہاراں کیا
برف میرے نشیمن پہ آ کے گری
دھوپ نکلی تو اس کو ہراساں کیا

اور میں چپ رہا

میرے سر سبز جنگل اُجاڑے گئے
میری جھیلوں میں اَجگر بَسائے گئے
کوہ ماراں کی تقدیس لوٹی گئی
بے حِسی کے مقابِر سجائے گئے

اور میں چُپ رَہا

*

ہماری بات

ہماری بات ہی مختلف ہے۔
دھُوپ کی تمازت سے ہماری جِلد کالی ہو گئی
خون نے رگوں میں دوڑنا پھرنا بند کر دیا،
اور ہماری چیخ و پکار میں پناہ لی ۔

پھر ہم اپنے ہمزادوں کو پالکیوں میں اٹھا کر
اونچے پربتوں پر بیٹھے دیوتاؤں سے مِلانے کے لئے گئے،
ہماری پالکی میں
ایک نہیں دو نہیں،
تین تین ہم زاد بیٹھا کئے، اور
آسماں کی بلندیوں میں اُڑنے والے پوَن ہنس سے آنکھیں چار کرتے رہے
جس میں ایک مہایُگ کا یوگی — بھگوان بن کر فضاؤں سے
اپنے درشن کی روشنی بانٹتا تھا۔

ہمارے ماتھے سے پسینے کے قطرے گر کر
جب آنکھ کی پُتلی میں سما جاتے،
تو ایسا لگتا کہ دریائے فُرات پر کوئی کشتی رَواں ہے
اور لَلّہ ایشوری ہمیں شیو کے دیس سے بُلا رہی ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا
کہ ہمارا سارا لہو سوکھ گیا
اور بالکل پیلا ہوگیا
جیسے کسی لق و دق صحرا میں سرسوں پھولی ہو
اور پھر برف کے گالے، خوابوں میں ہمیں لوری سنانے لگے
صبح ہوتے ہی دھوپ رجز گانے لگی۔

ہماری بات ہی مختلف ہے،
ہم پر کوئی وشواس نہیں کرتا،
اسلئے کہ ہم نے آج تک شک کی روشنی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔

لوگ زبیر رضوی کے علی بن متقی کی بات سنتے ہیں
مگر سبز علی سکوتی کا نغمہ نہیں سنتے
گو کہ وہ نغمہ آج بھی پیر پنچال کی چوٹیوں سے ٹکرا کر
چٹانوں کی رگوں میں دوڑتا ہے
پھر جب برف پگھلنے لگتی ہے، تو آبشاروں میں اس کی
گونج سنائی دیتی ہے۔

سبز علی سکوتی کے نغمے بھی مختلف ہیں۔

وہ کہتا ہے :

بیگار پر جاتے ہوئے اُس نے نیلم کی وادی میں سونے کی کوشش کی،
تو اچانک سورج زمین پر اُتر آیا اور سورج کی ٹانگیں اُگ آئیں۔

وہ کہتا ہے :

سورج زمین پر رینگنے لگا، اور برف کا لبادہ اوڑھ کر
پیر پنچال کی چوٹی پر ہُو، ہُو کا نعرہ لگانے لگا۔

ساری وادی
ہُو، ہُو کے نعرۂ مستانہ سے گونج اُٹھی،
اور پھر ہواؤں نے سورج کی راہ میں
نرگس، زعفران اور بنفشے کے پھول نچھاور کئے،
یہ دیکھ کر سورج ہواؤں کی نادانیوں پر مُسکرایا
پھر رقص کرتا ہوا
وہ ہمارے قریب آیا،
اتنا قریب کہ ہم نے اُس پر اپنی جانیں فدا کر دیں۔

ہم گھنے بنوں سے ہاتھی پکڑ کر لے آئے
اور انہی سڑکوں پر دوڑائے،
جن پر ہم اپنے ہم زادوں کو پالکیوں میں
بٹھا کر، سیر کراتے تھے۔
انہی سڑکوں پر ہم نے اپنی جانیں اپنے ہم زادوں کو
پٹے پر دے دیں،
برسوں کے لئے نہیں، روشنی کے کئی برسوں کے لئے
اسی لئے سبز علی سکوتی کو جگانے کے لئے سورج زمین پر اُتر آیا تھا
برف کا لبادہ اوڑھے۔

ہماری بات مختلف ہے
پیر پنچال کی ایک چوٹی پر تپسیا میں مگن ریشی نے کہا،
آہوتی دو،
ہم نے آہوتی دی،
بچے قربان کئے
یہ سوچ کر کہ ہماری آہوتی قبول ہو گی،
اور ہم رولس رائس کے پہیوں کے نیچے
اپنے ہم زادوں کو کچل دیں گے۔

ہماری آہوتی منظور ہوئی
زمین کی کوکھ سے نرگس، زعفران اور بنفشے کے پھول پیدا ہوئے۔
ہم نے سورج کو الوداع کہا،
سورج ہمارا جشن دیکھ کر چِلّایا۔
اور برف کا لبادہ تیاگ کر فضا میں اُڑ گیا،
ہماری پیاسی آنکھوں نے اس کا تعاقب کیا، اور ہم اندھے ہو گئے۔
ہماری آہوتی منظور ہوئی،
بہار آئی،
مگر پیڑوں پر سیب لگے نہ بگو گوشے،
بلکہ انسانوں کی کھوپڑیاں لگ گئیں۔
ہم بہت خوش ہوئے
اور ہم نے اپنے ہم زادوں کی دعوت کی،
اور جِنوں کو کاک ٹیل پر بلایا۔

*

تیزاب، آکار خوشبو کا

نیبو پہاڑی کے دامن میں
ایک گاؤں ہے،
'مدراین'
جہاں میں پیدا ہوا تھا،
(میرا نام محمد فاروق ہے)

میری ماں سیب کی طرح سُرخ اور میٹھی تھی
گلاب کی طرح کومل اور معطر
وہ خوشبو کا آکار تھی۔
لگی لپٹی، چھل کپٹ، جھوٹ
یہ لفظ اُس نے سنے تو تھے،
آزمائے نہیں تھے،
دُہرائے نہیں تھے۔

ریڈیو سے نزار قبانی کا قصیدۂ متوحشیہ نشر ہوتا
یا کوئی مُغنّی، کالیداس کا ریتو سمہار سُناتا
تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی،
میں پوچھتا رونے کا کارن،
تو کہتی:

دیوتاؤں کی اِن زبانوں میں
جادو کا اثر ہے،
ان میں ستیہ کی دِشا
اور صِراطُ المستقیم کی نِشاندہی ہے۔
میں بارہا اسکی سادگی پر رو دیتا

میرا باپ دانتوں میں ڈائنامایٹ دباتے
انگلیوں کے پوروں میں تیزاب کے بَن اگاتا ہے
اور پیلے مردہ، مریل کاغذ کے چہرے پر
لہو کے پھول کاڑھتا ہے۔

خود سے الگ ہو کر، خود پر مٹ کر
اپنی جائیداد سے پیار کرنے لگتا ہے۔
وہ آٹھ جہازوں کا مالک ہے
جو اس نے وقت کے سمندر کے پانیوں پر اتار دیتے ہیں
اور خود ایک کنٹرول رُوم میں بیٹھ کر
ان کی حرکات کا تعیُّن کرتا ہے۔

میں بھی اس کا ایک جہاز ہوں
پتھر چبانا، پلکوں کی جھاڑیوں پر سدرہ اگانا
صبح سویرے مسجد کے دروازے پر خدا سے
آنکھیں چُرا کر گزر جانا
اور خُدا کے محبوُب پر فریفتہ ہو کر
خدا سے رقابت بانٹ لینا
اس کی ادا بن گیا ہے۔
میں سرخ میٹھے سیب اور تیزاب کے اِسی
اِمتزاج کی پیداوار ہوں،
میں کون ہوں ؟

ویٹنگ لِسٹ

کوئی رک جائے تو
تم جاؤ گے،

کوئی رہ جائے تو جاؤ گے اسی گاڑی سے
بے قراری کو دلِ زار سے خارج کر دو

تم بھی جاؤ گے اگر اذنِ سفر مل جائے
تم بھی جاؤ گے اگر کوئی یہاں رُک جائے

*

سُرخیاں

مجاہدوں پر فوج کی یلغار'
درجنوں مردانِ حُر موت کے شکار'
نامعلوم مجاہد کی لاش گٹر سے برآمد'
سات سالہ مجاہد
پچاس فوجیوں پر حاوی
معصومُ الاِسلام کی عظیم موت
والدین کو مجاہدوں کے سربراہ نے قرآنِ حکیم کا
نسخہ پیش کیا۔
جو معصوم کی اَن پڑھ ماں نے مخمل کے غلاف میں
بند کر کے طاق پر رکھ دیا۔
کھڑکی سے جھانکتی ہوئی ہوا نے کہا:
'اِقراء'

ایک مرثیہ اور

گُل ریز کی موت پر نوش لب کے ہونٹ زہر اگلنے لگے
سحر گزیدہ رات کے دامن پر تازہ لہو کے دھبے نمایاں ہوئے
گُل مرگ کی برف پوش چوٹیوں پر ایک سُرخ گلاب کھِلا ہے
کارتِک کی بے باک ہواؤں کے آنچل پر سورج نے لکھا ہے۔
اس سُرخ گلاب کی پنکھڑیاں روز گرتی ہیں،
اور روز نکلتی ہیں۔
بہار آئی تو مغنی نو روزِ صبا کا راگ چھیڑ کر خاموش ہوا
سُننے والے رجز خواں کی موت کا سوگ منا کر
دریاؤں میں بہتا لہو پینے میں مصروف تھے۔

احساس

اگرچہ پتّے بے شمار ہیں،
شجر تو ایک ہے۔
جوانی میں،
اُجلے دنوں کی سنہری دھوپ میں
میرے پتّے، پھول گر گئے۔
اب میں بھی سچ کی آغوش میں جذب ہونے کیلئے تیار ہوں۔

منٹو کی سُلطانہ بولی

جَب جَب جس نے چاہا آیا راتوں کی تنہائی میں
صبح ہوئی تو ایسا دیکھا جیسے ایک پرائی میں
لوگوں کی کیا بات کریں وہ آتے جاتے رہتے ہیں

توپوں کی گھن گھن نے پورے نیل گگن کو گھیرا ہے
جس کھائی میں جنگ ہوئی تھی اسمیں فوج کا ڈیرا ہے
یدھ چھڑتے ہی گدھ پیڑوں پر گھات لگائے رہتے ہیں

اُجڑے گھر کے جس آنگن میں سارا بچپن گزرا تھا
جس کی ٹوٹی دیواروں پر مایوسی کا پہرہ تھا
آج اُسی کے بام و در پر دیپ سجائے رہتے ہیں

جگ کیا جانے مَن کے اندر کتنے دَریا بہتے ہیں
جسم ہمارا اک رستہ ہے، لوگ گزرتے رہتے ہیں
چپ رہتے ہیں، غم سہتے ہیں اور سدا یہ کہتے ہیں
بھید دِلوں کے جو جانے ہے، وہ جوگی کب آئے گا!

*

یہ کیسی رُت آگئی جنوں کی

میں اپنی بیوی سے بات کرتے
نپے تُلے لفظ بولتا ہوں،
میں اپنے دفتر میں ساتھیوں سے
لِکھی ہوئی بات بولتا ہوں
میں اَپنے لختِ جگر سے اکثر
نظر ملانے سے کانپتا ہوں
یہ کیسی فصلِ بہار آئی
صَبا سے خوشبو ڈری ہوئی ہے
یہ کیسی رُت آگئی جنوں کی
نسیم گلچیں سے مِل گئی ہے

جو تے خوں اُبھرتی ہے

خون خون پربت نے
زخم زخم کرنوں کی
اوڑھنی کو پہنا ہے

شام شام وادی میں
برف برف سردی میں
تال تال آندھی پر
ناچتی ہیں تتلیاں

دام دام زلفوں میں
آنسوؤں کی لڑیوں میں
جگنوؤں کے میلے ہیں

نیند نیند آنکھوں میں
خواب خواب بیداری
فیصلے کی تیاری
جائزوں کے تجزیئے

خواب کے سمندر میں
اِک جہاز اترا ہے
چاندنی بھی اُتری ہے

پھول پھول وادی نے
خار خار راہوں پر
روشنی لُٹائی ہے
پابرہنہ صبحوں سے
خون پھر ٹپکتا ہے
جوئے خوں ابھرتی ہے
ملگجے اُجالوں پر

عنوان

میں اپنی لوحِ بدن تم کو سونپ دیتا ہوں
جو لکھ سکو تو لکھو اس پہ نوکِ خنجر سے
نئی بہار نئی آرزو کا افسانہ
نئی کتاب نئی روشنی کا پیمانہ

*

چلّۂ کلاں

ایک پہاڑی کے دامن میں
گہرے، نیلے، گول چناروں کے سائے میں
اِک ندیا ہے
لہراتی، بل کھاتی ندیا،
ندی کنارے اک گاؤں ہے
اس گاؤں کے اِک ٹیلے پر
اپنا گھر ہے،

اپنے گھر کے آنگن میں اِک خوبانی کا پیڑ کھڑا ہے
جیٹھ کے میٹھے موسم میں جب پھول
کھِلا کرتے آنگن میں،

خوبانی کے پیڑ سے جھڑ کر
فرش پہ گرتی پتی پتی
پتی پتی ہم چُن لیتے،
دَھاگا لے کر ہار بناتے،
گڈا گڑیا کا ہم مِل کر بیاہ رَچاتے،
اُن کے گلے میں ہم ہار سجاتے
گول چناروں کے سائے میں
گیلی پیلی مٹی سے ہم
تختی پر جب
الف لکھتے،
الف سے پھر اللہ لکھا
ب سے پھر بسم اللہ لکھا

ب بسم اللہ

ل لکیریں

کیا کیا لِکھا، کیا کیا سیکھا،

م مقدر،

م مزّمل

م منّور

م سے ماضی

م سے مسجد

م سے مستقبل جب لکھا،

رفتہ رفتہ

لفظوں کے پھر چہرے بَدلے

پ سے پارہ

پ سے پانی

پ سے پتا جھڑ

پ سے پتھر

خوبانی کے پیڑ پہ مارا

اور زمین پر خوبانی کے ڈھیر لگائے ، ا

ننھے ننھے ہاتھوں نے پھر
لفظوں کو معنی پہنائے
ننھے اکھشر
سادہ اکھشر
گول مٹول سے پیارے اکھشر
معنی کے پہناوے پہنے
سُر ساگر کی لہروں جیسے
پتوں پر شبنم کے قطرے
اکھشر رنگ بَدلتے اکھشر
بَربادی کے سائے اکھشر
نفرت کے پیرائے ــــــ اکھشر
پھول سے جو نازک لگتے تھے
ناگن سے لہرائے اکھشر
گول چناروں کے سائے میں
صبحیں بدلیں، شامیں بدلیں
راتیں بَدلیں، باتیں بدلیں

ماتم نیم شب

جب میں اور تو نڈھال ہو جاتے ہیں
سانسیں پھولتی ہیں
اور ہم پہلے ڈھیلے اور پھر سرد پڑ جاتے ہیں
اور ہمارے چہرے اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں
تو بے اختیار سوچتا ہوں،
ہمارا کیا ہوگا ـــــ اگر ساتھ چھوٹ گیا
تمہارا کیا ہوگا ـــــ میرے بغیر
میرا کیا ہوگا ـــــ تیرے بغیر

میں تو سوچ بھی نہیں سکتا
کہ تو میرے جیتے جی مر جائے
اور نہ یہ سوچ سکتا ہوں
کہ تو کیسے روئے گی
اگر میں تم سے پہلے مر گیا
ہم کتنے بے بس اور اکیلے ہیں۔
کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی جانیں اک ہی قالب میں سمولیں،
تاکہ من و تو کا جھگڑا ہی مِٹ جائے۔
ہم ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں،
ہمارا مذاق اور مزاج ایک ہے
ہمارا لطفِ بدن ایک ہے۔
ہمارا سچا من ایک ہے،
تو پھر ہم جُدا کیوں ہو جائیں
کوئی راستہ نہیں کیا
کوئی چارہ نہیں کیا
ایسی کوئی صورت بنا
کہ ہم دو دِلوں کو دھڑکتا
اور دونوں کو چمکتا رکھ سکیں۔

اور پھر
میں شہر در شہر جاگتا پھروں
کوچہ و بازار میں بھاگتا پھروں
اور تیری آواز ہمیشہ آسماں کی بلندیوں سے
اترتی رہے اور زمین کو جگاتی رہے ۔
اور میں محبت کے ساگر پر سُروں کی وَرشا کروں
جسم کتنا نحیف ہے
اور ہم اِس لئے اِس قالب میں ڈھالے گئے
کہ فنا کی لذت سے آشنا ہو جائیں
میں موت کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچتا ہوں
جَب تیری سانسیں میرے شانوں پر دستک نہیں دیتیں،
تو میں کانپ اُٹھتا ہوں
میں موت کے سکوت سے ڈرتا ہوں

مگر وہ گھڑی آئے گی

جب ہم میں سے ایک پہلے زمین میں اُترے گا
سوسن کے سفید اور کاسنی پھولوں کی چادر اوڑھے
ہر طرف سے رونے کی آواز آئے گی،
پھر خاموشی ہوگی
سکوت ہوگا
اور قبر میں سکوت اچھا لگے گا
اور قبر سے باہر جسے سکوت برداشت کرنے کی سزا ملے گی
اس کی حالت کتنی بھیانک ہوگی
اب تو ہی بتا کیا کریں
کتنی مشکل صورتِ حال ہے
کہ تیرے گداز بدن کے لمس سے اور
تیرے لفظوں کی کھنکھناہٹ سے ہی
میں تیری محبت کو سمجھ سکتا ہوں

بدن سے پرے
سرحدِ ادراک کے اس پار
میں تم تک رَسائی پانے سے قاصِر ہوں
اور جب جسم کا یہ رشتہ ٹوٹ جائیگا
تو جہاں ہم اِس وقت سوچ میں گم ہیں
وہاں ایک خالی پنجرہ ہو گا۔

*

حسنِ برگزیدہ

وہ پُرنور بزرگ
اور برگزیدہ شخصیت
میرے سامنے آئی
تو یوں محسوس ہوا
جیسے کسی معبد میں
سفید شمع روشن ہوئی ہو

وہ مسکرائی
تو یوں محسوس ہوا
جیسے چِلّہ کلاں کے سورج کی تمازت
اپنے آپ سے بیزار ہوئی ہو،

اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا'
تو یوں محسوس ہوا
کہ منجمد پانی پر ایک برباد پن چکی ہلنے کی کوشش کر رہی ہے۔

*

نیند کیوں نہیں آتی

رات خامشی لے کر،
جھولتی ہے پیڑوں پر
دشت دشت ویراں ہیں،
روشنی کے ہنگامے
تیرگی برستی ہے
اونچے نیچے ٹیلوں پر
نیند کیوں نہیں آتی

میں اُداس رہتا ہوں
دن کے گرم میلے میں
میں ملول رہتا ہوں
شام کے جھمیلے میں
میں شراب پی کر بھی
ہوشیار رہتا ہوں
جو بھی دِل پہ لگ جائے
میں وہ زخم سہتا ہوں
سوچتا ہوں، دنیا میں
میں بھی کِتنا تنہا ہوں
چاندنی کے پہلو میں
دِل نواز کِرنوں کو
اوڑھ کر میں لیٹا ہوں
نیند کیوں نہیں آتی

نیند ایک خوشبو ہے
رات کی فضاؤں میں
کُو بہ کُو بھٹکتی ہے
میرے گھر نہیں آتی
مجھ سے دور رہتی ہے
پھر میں خود سے کہتا ہوں
نیند کیوں نہیں آتی

*

ایک خیال

دریوزہ گری لفظوں کی کروں
اور معنی کی سوغات نہ لوں
جو بات زباں پر آجائے
لہجے کا نیاپن اس کو کہوں
میں ایسا کر ہی نہیں سکتا
الفاظ سے میں بیزار نہیں
معنی سے مجھے اِنکار نہیں

*

ایک نظم

میری ناکامیاں
خیر چاہنے والے پڑوسیوں کی طرح میری ساتھی بن گئی ہیں
میرے گھر کے کھلے دالان میں
بکھری پڑی کرسیوں پر پہروں بیٹھی رہتی ہوں
جیسے میرے ہی کنبے کے افراد ہوں

سچ تو یہ ہے،
کہ میری ناکامیاں میری طویل سنگت میں مجھ جیسی لگنے لگی ہیں،
'جمالِ ہم نشین در من اثر کرد'

دسمبر کی زمہریری شام
کتنی دِلآویز اور پُرجوش ہوا کرتی تھی
جَب میں مستی کے خزانے لٹاتا
برف سے اَٹی پڑی سڑکوں پر دوڑ لگاتا تھا
اور اب
میری ہمراز میری تنہائی
میرے چہرے پر سردی کی شدت کا کرب پڑھ لیتی ہے
اور میری کوئی چھوٹی سی ناکامی
میرا ہاتھ بن جاتی ہے
اور گیلی لکڑی کا ٹکڑا انگاری میں ڈال دیتی ہے
اس سے کمرے میں بَدبو تو پھیل جاتی ہے
لیکن میرا سُن اور بے حِس بدن گرمی محسوس کرتا ہے
اور میں اونگھتے اونگھتے جاگتے میں سوچا تا ہوں

*

۱۹۸۴ء کی ایک شام

مجھے خبر ہے کہ
تو پہاڑوں کے زیر سایہ
سنہرے موسم کے زرد لمحوں سے
زندگی کی ہنسی چرا کر
سیاہ کمرے میں منہ چھپائے
سفید اندر سفید موسم کی منتظر ہے

تجھے خبر ہے کہ
میں سلگتی اداس شاموں کی نیم مُردہ اُجاڑ بستی میں
بے ارادہ
ہوا کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کر
ردائے ابرِ رواں کو اوڑھے
تری فضا پر برس رہا ہوں
مجھے خبر ہے کہ
تو چناروں کے سُرخ پتّوں سے
جسم ڈھانپے
مجھے خلا میں چھپا رہی ہے

دعا

مجھے مرنے سے پہلے زندگی کے گرم ہنگاموں سے خارج کر
مرے احساس کو پھولوں کی خوشبو، چاند کی دھیمی حلاوت دے،
مجھے فکرِ جہاں دے، لذّتِ دُنیا سے فارغ کر،
مجھے وہ خواب دے جو میری آنکھوں کو طراوت دے،
مجھے پیری میں رسوائی کے ڈر سے بے گماں کر دے،
کہیں ایسا نہ ہو —— اپنی نظر سے گر کے بھی،
زندہ رہوں مولا!
کہیں ایسا نہ ہو مولا!
کہیں ایسا نہ ہو مولا!

تنہائی

کئی دنوں سے وہ شب زاد و شب نژاد مرا
مرے وجود سے خود کو چھڑا کے بھاگا ہے
مرے وجود میں وحشی نژاد جاگا ہے

*

گوشت کا راجہ

ایک جلتی کہانی

پہاڑ کے اس طرف
چکور اپنے بچے لئے
ترائی سے اتر رہے ہیں
میری زلفیں گھٹنوں سے بھی نیچے آگئی ہیں

پھول کھل رہے ہیں
بنفشہ گول مٹول پتھروں کی اوٹ سے میری طرف دیکھ رہا ہے
اور اچانک ــــــ
دُرِ ناسفتہ سے چاندی کی دھار چھوٹ کر بہتی ہے۔

جی چاہتا ہے
خار خار شاخِ گلاب کو اپنے جسم میں اتار دوں،
اور پھر لہو کے سمندر پر سفید پھولوں کی پتیاں
یوں تیرنے لگیں،
جیسے خواب کے سمندر میں میرے وجود میں
مرمریں کشتیاں تیرتی ہیں۔

سوچتی ہوں،
میری رگوں میں ٹھہرا ہوا سیلاب
کب تک اندھیری رات کے باندھ سے بندھا
رہے گا۔

وہ آئے گا
اور میں مرجھا گئی ہوں گی،
چکور پہاڑی کے اس طرف لوٹ آئے
ان کے بچے بڑے ہوئے،
بکھر گئے۔

میری زلفیں میری ایڑیوں کو چھپا رہی ہیں
وہ آئے گا
اور میں مرجھا گئی ہونگی۔

وہ خونخوار درندوں کا شکاری
میرے جسم کے جنگل میں کہرام کیوں نہیں مچا دیتا
وہ میری ٹہنیاں مروڑ کر کیوں نہیں رکھ دیتا۔

میں نے ایک بھیڑیا دیکھا ہے
میں اُسے شفاف شہد کی دھاروں سے نہلاؤں گی،
میں اُس بھیڑیئے کے بالوں سے اَٹے جسم کو،
اپنی زباں سے چاٹ لوں گی۔
میں نہیں ٹھہر سکتی،
میں مرجھانے سے پہلے اپنی ٹہنیاں جھاڑ لوں گی۔
وہ آئے گا،
اور بھیڑیئے کے پنجوں سے روندھی ہوئی
شیرنی کا شکار کھیلے گا۔

مشورہ

بند کمروں میں بہت وقت گذارا تم نے
کھڑکیاں کھول دو،
در کھول دو،
آجانے دو،
نرم چمکیلی طرحدار ہوا کے جھونکے،
جسم دیوار بنے
اس کو ہٹا دو ایسے
جیسے دیوار سے تصویر ہٹا دے کوئی

*

۱۹۹۰ء کی ایک صبح

بھاری کالی کمبل اوڑھ کے سویا ہوں
دِن نکلا ہے
سورج گرمی لایا ہے،
میں خوابوں کے گہرے کالے غاروں میں
خوف کی تلواروں کے نیچے بیٹھا ہوں،

مجھ کو ڈر ہے
وہ آئیں گے
جن کی آنکھیں نِشتر بن کر
دل میں گھاؤ بناتی ہیں۔

وہ بے چہرہ لوگ تو باتیں کرتے ہیں،
کان بھی انسانوں کے جیسے
ہونٹ گلابوں جیسے لیکن
خون اگلتے رہتے ہیں۔
چہرے ڈھانپے
ابلیسوں کے وارے نیارے،
اپنے ہاتھوں پھول مَسل کر رکھتے ہیں۔
میں ڈرتا ہوں
وہ آئیں گے۔

مجھ سے میری نظمیں غزلیں،
میری باتیں، میری یادیں،
اور لطیفے میرے
جو ہر بزم میں پھول کھلاتے ہیں۔

میرے جملے ـ جو میری پہچان بنے ہیں
سب کچھ راکھ کریں گے ظالم،

دن نکلے تو میں ڈرتا ہوں،
رات بھئے تو میں ڈرتا ہوں،
بھاری کالی کمبل اوڑھ کے سویا ہوں

*

ایک نظم جنگلوں کے نام

زمین شعلے اُگل رہی ہے،
فضا سے تیزاب گِر رہا ہے،
زمین اگنی پہ لوٹتی ہے،
ہوائیں چہرہ بگاڑتی ھیں

سُنا تو تھا
آج دیکھتے ہیں
یہاں ہوائیں ہیں نارسیرت

ازل سے لے کر ابد تلک بے قرار ہونگی،
ہماری روحیں
جنم جنم تک
بھٹک بھٹک کر
فنا فنا بے کراں تباہی کا نام لے کر۔
نہ پیڑ ہوں گے
نہ قمریوں کے سریلے نغمے
شِوالکا پر نہ کوئی جوگی
صَدائے جشنِ بہار دے گا،
کوئی قلندر نہ کوئی رُومی،
نئے سُروں کی تلاش کرنے،
کِسی نَیستاں میں جا رُکے گا۔

*

موت

عجیب لمحہ ہے
موت کا بھی،
نہ خوف ساتھی
نہ آس ہمدم

عجیب شئے ہے یہ آدمی بھی
جو موت کے ڈر سے کانپتا ہے
جو آس کی ڈور تھامتا ہے،

اُسے خبر ہے کہ موت کیا ہے،
مگر وہ پھر بھی
فصیلِ بیم و رجا کا قیدی
خود اپنی کرنی سے بھاگتا ہے،
اُسے خبر ہے کہ موت جینے کا آسرا ہے
اُسے خبر ہے
عجیب لمحہ ہے موت کا بھی
نہ آس ہمدم
نہ خوف ساتھی

*

سیاہ سفید

بہت سے چہرے ملول ہوں گے
خزاں رسیدہ گلاب جیسے،
ہوائے آتش دہن کو چھو کر
گلاب چہرے
شراب چہرے
کتاب چہرے
بنیں گے یوں بے حساب چہرے
زیاں دلوں کا، عذاب چہرے

پیاس ہوگی دہن دہن جب
وہی پیئیں گے رطوبتیں جو
اُبلتے چشموں سے بہہ پڑیں گی
ببول کھا کر زبان دانتوں اور مسوڑوں میں

ریزہ ریزہ
لہو کے قطروں میں بہہ پڑے گی،
نفس نفس بھوک
آگ بن کر
مَسام اندر مَسام ہوگی
بہت سے چہرے جمیل ہوں گے،
کھِلے کھِلے بس گلاب جیسے
بلندیوں پر گلُوں کے جھُرمٹ میں
سَبز موسم کی تازگی میں
گھنے درختوں کے سائباں میں،

سکوت کا راگ سنتے سنتے
نِدا نِدا
بے صدا صدائیں
خموشیوں کا لباس پہنے
جمیل چہروں کو چوم لیں گے۔
نہ کوئی منبر
نہ کوئی واعظ
سخن طرازی کا بند دفتر
خطاب ہوگا نہ بات ہوگی
سکوت ہوگا۔
چمکتے چشموں کا صاف پانی
نِشست پیڑوں کے سائباں میں
ہزاروں ساغر کنارِ آبِ رواں ملیں گے
سکوتِ پیہم کے جام ہوں گے۔

جہانِ سود و زیاں میں جس نے
یہ بات مانی،
پہاڑ اس طرح کیوں کھڑے ہیں،
زمین مسطح ہوئی تھی کیسے
اُسی کا چہرہ جمیل ہوگا

*

ریت گیت

پتوں کے پہناوے پہنے
ٹہنی ٹہنی سوئی ہے،
مٹی کے پیلے ٹیلوں پر
کس نے چاندی بوئی ہے،
شبنم شبنم انگارے ہیں،
پتی پتی شعلہ ہے
صحرا صحرا بات چلی ہے
ریت بہت ہی روئی ہے
کچھ بھی ہاتھ نہ آیا تیرے
گھاؤ لگے بس ہاتھوں میں
برسوں تک کندن کی خاطر
تو نے مٹی دھوئی ہے ۔۔

جب بڑھاپا آئے گا

جب بڑھاپا آئے گا
بال جب جھڑ جائیں گے
نیند سے بوجھل تری پلکوں پہ آئے گی تھکن
پاس آتش دان کے
سُرخ ہوگا جب ترا چہرہ
تو شعلوں کی تپش
تجھ کو چپکے سے کہے گی

یاد کر

جَب تری پلکوں کے نیچے میکدے آباد تھے
جب تری مژگاں کا سایہ رات سے تاریک تھا
یاد کر
جَب ترے انداز پر سرو سمن کو ناز تھا
جَب تری مُسکان سے کلیاں چٹکنے کی صدا
آتی تو آوارہ ترا ـــــ
روح میں تجھ کو چھپا
تیری مسافر آتما کو نام دیتا پیار کا
اور ترے چہرے پہ ٹھہری تازگی کو دیکھتا
یاد کر
جَب بڑھاپا آئے گا
تجھ کو بہت تڑپائے گا

*

اک پری آکاش سے اتری

ایک پری آکاش سے اتری
نیلی رات کے سناٹے میں
صبح ہوئی جب سورج نکلا
اُس نے دیکھا ٹوٹے درپن
اندھی بستی سے غائب تھے
گونگی بستی کے آنگن میں
سوکھے پیڑ کی اِک ڈالی پر
ایک پپیہا بول رہا تھا

*

کشپ رشی کی نگری جیوے

پیلی مٹی ــــــ سونا جیسی
پیاری گلیاں ــــــ کاہکشاں
کشپ رشی نے نگر بسایا
خود جانے کس اور گیا

اونچے پربت
شیو کی بانی
حق اللہ ہو
مسجد خوب
ٹہنی ٹہنی جھول رہے تھے رنگ برنگے پنکھ بکھیر
پھول سی نگری
سورج بستی
ذرہ ذرہ بانٹے نور
کشپ رشی کی نگری جیوے
ہم اس کے دیوانے ہیں۔

پیرہن

مرے پیرہن میں جڑے ہوتے
گئے موسموں کے گل و سمن
مرے پیرہن میں جڑے ہوتے
تھے روایتوں کے کئی گہر
مری بات سے مری ذات تک
گئے موسموں کا گداز تھا،

مجھے دیکھ کر یہاں بوالہوس
مرے پیرہن کے گداز کو
مرے نغمۂ جاں نواز کو
لگے بیچنے سرِ رہ گذر
میں نے پیرہن کو جلا دیا
میں برہنہ راہ پہ چل دیا

چاند مٹی کے درمیاں

چھٹے دلائی لامہ کے خیالات

نئے نویلے پھولوں پر اِک کہرا ہے
شیتل شیتل پَون کا چومکھ پہرا ہے
رُت پھاگن کی دیکھ کے تتلی کانپ اٹھی
پھلواری میں سردی کا اب ڈیرا ہے

مَدھومتی کی گونج نہ اب ملہار کوئی
میگھ گگن میں جیسے سوتر دھار کوئی
دَھرتی سے چُپ چاپ کہے اُبھرتی ماں
تیرے پھول اٹھا لایا اُس پار کوئی

آج کھلے پھولوں کی چھم چھم آج ہی آج
کل مرجھائیں، رنگ مٹے اور باس نہ ہو
جیسے یووک کال کے در پر سیس جھکائے
سیدھا اکھشر جھک جائے احساس نہ ہو

میرا من بس تیری سوچ میں ناچے ہے
میرا درپن تیری صورت مانگے ہے
تجھ سے کٹ کر جگ سے میں کٹ جاتا ہوں
میرے بھیتر کوئی آ کر جھانکے ہے

پھول کھلیں مرجھا کر بکھریں چاروں اور
رونا دھونا تِتلی کا سوبھاؤ نہیں
ہم دونوں کی دُوری طے ہے جانِ من
دوری ایک نشانی ہوگی گھاؤ نہیں

نیند پرائے دیس گئی ہے، نین کھُلے
جان مری پردیس رہی ہے، نین کھُلے
چُور تھکن سے جاگ رہا ہیں ساری رات
بھور، پیا چو دیس بھئی ہے، نین کھُلے

ہنس کے من کو دریا ایسا بھائے ہے
سانجھ سویرے پانی پر لہرائے ہے
ماگھ شِشر میں پانی جب جم جائے ہے
ہنس اڑے چپ چاپ نہیں شرمائے ہے

کاٹھ کا گھوڑا کیا جانے دکھ سکھ کی بات
پھر بھی آنکھوں آنکھوں سے اِک بات کہے
لیکن میں جس نار کی دھن میں پاگل ہوں
نِردئی ایسی مل کر بھی کب ساتھ رہے

○

بارش کی بوندیں گِر کر بہہ جاتی ہیں
سوچوں کی چٹانیں بھی ڈھہ جاتی ہیں
پیار کے اکھشر لکھتے ہی مٹ جاتے ہیں
آشائیں ہی آشائیں رہ جاتی ہیں

○

پتھر، دھات یا کاغذ پر جو کھینچا ہو
اکھشر، گیت، چھبی، کسی کا سایہ ہو
مٹنے کو ہر وستو تو مِٹ جاتی ہے
امر وہی جو اکھشر دل پر لکھا ہو

میں بھنورا نرگس کا پریم جگاتا ہوں
نرگس میرا گیت، اسی کو گاتا ہوں
نرگس کو پت جھڑ کی بھینٹ چڑھاتی ہو
رک جا بیری آندھی، میں بھی آتا ہوں

من میں میری آن بسی جو نار سجل
اس کے بس میں بستی پربت جل اور تھل
اس کی آشا میری جیون دھارا ہے
ہر موسم میں مجھ پر برسے جوں بادل

صوفی اور سنتوں کی باتیں اچھی ہیں
میرے من کو ان کی باتیں چبھتی ہیں
لیکن دھیان تمہاری اور لگا ہے یوں
تیری بات بِنا سب باتیں کھَلتی ہیں

ہر پل دھیان گرو کا مجھ کو رہتا ہے
پھر بھی اس کا مکھ مجھ سے کیوں چھپتا ہے
میں جس سندر نار سجل پر لوٹ ہوا
پل چھن من میں اس کا چہرہ کھلتا ہے

تجھ پر ہم نے جتنا دھیان دیا گوری
اپنے من میں اتنا دھیان اگر دیتے
آنے جانے کے بندھن سے چھُوٹ جاتے
تیری پریت کا ہم بلیدان اگر دیتے

سورج جب میری قسمت کا چمکا تھا
پوجا کے جھنڈے چومکھ لہراتے تھے
پھول سی کومل نار، ا تیتھی میری تھی
ناگ مچلتے جو نہی ہم بل کھاتے تھے

بھیڑ بہت تھی اُس نے گھونگھٹ کھول دیا
رَس اپنی مُسکان کا جگ میں گھول دیا
لیکن اُس نے انکھڑیوں سے شرما کر
ساری بھیڑ پہ مجھ کو بھاری تول دیا

میں نے پوچھا کیا میری ہو جاؤ گی
بولی، "اِس جگ میں تو ہوں میں ساتھ ترے"
پانی، والو، آگ نہ بندھن توڑ سکے
مِر تیو جب آئے تو چل دوں ساتھ ترے

پریم پیار کا بندھن توڑ کے جانا ہے
پریت نگر کی گلیاں چھوڑ کے جانا ہے
ویاکُل مَن کو ایک ہی چِنتا گھیرے ہے
اُس ناری سے کیا مُنہ موڑ کے جانا ہے

یہ تیری مُسکان کی چاندی کیسی ہے
من آنگن پر وَرشا بن کر برسی ہے
تونے مجھ سے پیار کیا ہے سچ کہہ دے
تیری اِچھّا جاناں ! میری جیسی ہے

میں ہوں ایک شکاری جس نے جنگل میں
یتروک نامی ایک پری کو پکڑا تھا
نورزنگ گیالو، جو جنگل کا راجہ تھا
مجھ سے چھین کے اس آفت کو بھاگا تھا[1]

دین دَھرم کی شِکھشا مجھ کو بھائے ہے
پیر کے آگے مستک بھی جھک جائے ہے
ہِردے میرا ایسا چنچل، چوری سے
گیان دھیان تج، گوری کے گھر جائے ہے

[1]:- لامایتروک اور نورزنگ گیالو : ایک لداخی رومانی کہانی کے مرکزی کردار

اس کی کایا خوشبو بھینی بھینی ہے
دُور گگن سے اتری من میں شانت ہوئی
مجھ کو چھوڑ کے جب اُس نے بن باس لیا
اونچے پیڑوں اور پھولوں کے ساتھ ہوئی

کام پون کا پاگل جھونکا پل دو پل
میگھ گگن سے جیسے برسا پل دو پل
کایا کیا ہے دھرتی کا انمول سروپ
یووَن کیا ہے جھلمل تارا، پل دو پل

○

جس کو من کے سنگھاسن پر رکھا تھا
وہ سپنوں کی رانی کس کے ساتھ گئی
مُرلی کا سُر پھیکا پھیکا لگتا ہے
بھیتر کی وہ بانی، کس کے ساتھ گئی

○

برہا میں نینوں سے یوں اشرو برسے
دھیرج کے پتھر میں گہرا چھید ہوا
دن نکلا تو سورج پہن لیا میں نے
سانجھ ہوئی میں مدھوشالا کی اور گیا

گوری تو گوری ہے یا ہے مِرگ نینی
رات مرے پہلو میں تو بسرام کرے
بھور بھئے تو رین بسیرا چھوڑ مرا
اونچے پربت، گھنے بنوں کی اور چلے

چڑیا بید کی ڈالی پر چہکار کرے
پیڑ کی ڈالی جھوم جھوم کر پیار کرے
دونوں اک دوجے میں ایسے کھو جائیں
ان کو بھلا کیا شکرہ کی للکار کرے

جیون کے اس اونچے نیچے رستے میں
خوشیوں کے جو پل چھن ہم تم ساتھ رہے
وہ بیتے تو من ہی من میں سوچ لیا
اگلے جنم بھی ہاتھ میں تیرا ہاتھ رہے



گزشتہ کئی مہینوں سے میں غزل کی رنگا رنگ اور پُر پیچ دنیا کی سیاحت پر تھا یعنی ایک ادبی انجمن کے اصرار پر بیسویں صدی کے کم و بیش پچاس برسوں کی غزل کا ایک جامع اِنتخاب تیار کرنے میں مصروف تھا اور دُنیا و مافیہا کے دوسرے کاموں کا ہوش بھی نہ تھا کہ وادی سے پہنچنے والی ایک دِلدوز آواز نے مجھے نہ صِرف چونکا دیا بلکہ گھنٹوں اپنی گرفت میں رکھا۔ یہ آواز فاروق نازکی کے مجموعۂ غزلیات نے مجھ تک پہنچائی تھی۔ تلخ، ترش، شیریں، لگا جیسے کوئی سوختہ گردو پیش کے درمیان نوحہ کناں ہو۔ محسوس ہوا جیسے کوئی اپنی فردوسِ گمشدہ کی تلاش میں ہر آنے جانے والے سے اِستفسار کرتا ہو۔ عام طور پر چھوٹی چھوٹی بحروں لیکن نئی نئی زمینوں میں کہی گئی مختصر مختصر اِن غزلوں میں، میں نے ایک ایسے جہانِ معنی کی سیر کی جس پر کسی دوسرے غزل گو کے قدم نہیں پڑے۔ ان شعروں کے مطالعے سے تخلیق کار کے روحانی کرب، نفسیاتی پیچ و تاب، علوئے فکر، ترچھی اڑان اور شورشِ قلب کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اپنے اندر کے طوفان کو جس سہار اور سبھاؤ، جس ندرت اور جدت، جس مٹھاس اور رچاؤ کے ساتھ نازکی نے غزل کے پیرائے میں ڈھالا ہے اس کے نتیجے میں اِنتشار و شوریدگی کے پہلو بہ پہلو ان کے کلام میں عنائیت اور تغزل بھی کم نہیں۔ اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔"

مظفر حنفی

پروفیسر، اقبال چئیر، کلکتہ یونیورسٹی